آفریں

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا، کیا ہوتا
خالد

عفت موہانی

اٹھارہ روپیہ

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ ۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون:۔ آفس: ۴۳۵۵۹
رہائش: ۴۵۲۲۴

نسیم انہونوی نے سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

باردوم ستمبر ۱۹۸۲ء

اپنی بھانجی نجم السحر کی پارۂ جگر اور اپنی نواسی

آفرین سلمہا کے نام

اس توقع پر کہ جس طرح نجم السحر کو اپنے خاندان اور اپنی
سسرال میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوئی
اسی طرح آفرین بھی اپنے نانا نسیم انہونوی صاحب
اپنی نانی غزالہ بیگم اور اپنی والدہ نجم السحر
کا نام روشن کرے گی

(عفت موہانی)

تمنا بری ہم نشینی کی ہے

بس اِک ساعت مختصر کیلئے

خالد

کیا تکمیلِ نقشِ ناتمام شوق کی خاطر

جو تم سے ہو سکا تم نے جو ہم سے ہو سکا ہم نے

خالد

بھائی جان کی شادی میں صرف آٹھ روز باقی رہ گئے تھے۔ امی کے قول کے مطابق چونکہ ان کے گھر کی پہلی شادی تھی لہٰذا بڑی ارمانوں بھری بھی تھی۔ ابھی سے دور دراز سے عزیز اقارب کی آمد آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور گھر میں چہل پہل کے بہانے شور و غل بھی ہونے لگا تھا۔ عجیب عجیب سے گروپ بن گئے تھے جن میں بزرگ حضرات کی سنجیدہ محفل الگ رہتی، فلم زدہ لڑکوں کی کمپنی سب سے دور تھی۔ ایک طرف رنگ برنگی لڑکیوں کی دھنک بکھری تھی! اور ان سب سے بے چاری امی جو تنہا نپٹ رہی تھیں۔ ویسے بہت سی خواتین، لڑکیاں اور ملازم عورتیں ان کے ساتھ تھیں لیکن امی جب تک خود اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہ کر لیتیں۔ انھیں اطمینان نہ ہوتا! ۔ امی کی بھتیجی برکھا جو انھیں بے حد عزیز تھی۔ ان کے ساتھ مصروف تھی۔

اور سب سے الگ تھلگ اس ہنگامے کی دنیا سے بڑی دور آفریں اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ اسے ہر قسم کے غل غپاڑے سے بڑی وحشت ہوتی۔ چونکہ کچھ ادبی قسم کی ذہنیت رکھتی تھی۔ اور ہفتہ بھر کے بعد اس کا کوئی سا افسانہ بھی ہونے والا تھا۔ ماہنامہ " محفل " کا خاص نمبر بھی جلد ہی منظر عام پر آ رہا تھا اور ایڈیٹر صاحب اب تک اسے دو خط لکھ چکے تھے چنانچہ اپنی خاص اہمیت کا احساس

کچھ سنجیدہ اور معتبر بنا رہا تھا!۔ اب وہ فرش پر بچھے نرم رو ئیں دار قالین پر بیٹھی صوفہ سے پیٹھ ٹیکے بڑی جاں فشانی سے اپنے افسانے کی تکمیل میں مصروف تھی۔ اس کے بعد اسے ٹسٹ کے سلسلے میں نوٹس یاد کرنے تھے۔ کبھی کبھی اپنی تعلیم اور ادبیت میں بیلنس کرنا اس کے لئے بڑا دشوار ہو جاتا۔ لیکن اسے یہ پسند نہ تھا کہ وہ تعلیم پر اپنے لطیف سے رجحان کو قربان کر دے۔ ابھی کل سہ پہر کو یونیورسٹی کمپاؤنڈ میں اسے اپنے مجلّہ کا ایڈیٹر ملا تھا اور وہ بے حد سنجیدگی سے اس سے کہانی کی فرمائش کر کے یہ بات واضح کی تھی کہ اس کی تحریر کے بغیر یونیورسٹی میگزین بالکل بیکار بکار ہے گا!۔

اسے تھوڑا سا غرور محسوس ہوا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یونیورسٹی میگزین کا ایڈیٹر بڑا سنجیدہ خاموش اور کتنا تعلیم یافتہ تھا۔ اگر وہ افسانہ طلب کر رہا ہے تو پھر آفریں کو مغرور ہو ہی جانا چاہیئے!۔

اس کے خیال میں وہ اپنے افسانے کے کلائمکس پر پہونچی تھی ۔ دفعتہً اسے بھونچال کا جھٹکا لگا!۔

برکہ ہمیشہ اسی طرح آتی تھی۔ اس نے آفریں کے ہاتھ سے قلم اس طرح چھینا کہ سفید سفید کاغذ پر ایک لکیر سی بن گئی اور قلم نے ایک نیلا نیلا آنسو صفحہ پر ٹپکا دیا۔

یاد حشت!۔" آفریں کے گھٹنے پر سے فائل کھسک کر قالین پر گرا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے رُخسار دبا لئے۔

میں پوچھتی ہوں" تم اللہ رکھے آدمی تو ہو نا؟ ۔" برکہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ سچ کہو۔ آفریں ۔ تم اس قیامت خیز ہنگامے میں لکھ بھی سکتی ہو؟"

لکھتے ہوئے تم نے نہیں دیکھا؟" آفریں خفا ہو چلی تھی۔" لاؤ ادھر میرا قلم افسانے کا ستیاناس مار دیا تم نے۔ خدا کے لیے برکہ کچھ جمالیاتی حس پیدا کرو اپنے میں۔"

افسانے افسانے۔ سچ تم نے سر میں درد پیدا کر دیا۔ تمھیں یہ چھوٹے لیپا ٹی افسانے اور صدفی صد بنڈل کہانیاں لکھنے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ اتنے وقت میں کوئی ڈھنگ کا کام کر لیا کرو۔ چچی جان تم پر چیخ رہی تھیں۔ انھوں نے بھابی صاحبہ کا کمرہ تمھارے حوالے کیا تھا۔ ابھی تک کتنا سنوارا۔"

ہائے میں تو بالکل بھول گئی۔ برکہ بجیا۔ اللہ۔ اسے تم دیکھ لیتیں۔ مجھے اس کی سٹنگ کا کچھ بھی سلیقہ نہیں ہے۔ الٹا سیدھا کچھ کر دوں تو ابھی سب کے سامنے توہین فرما دیں گی!۔"

برکہ ہنسنے لگی۔" ایک شرط پر تمھاری بات مانوں گی!"

"دس شرطیں منظور!" آفریں نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔

اور اگر منظور نہ کرو۔" برکہ نے خوف دلایا۔

واہ۔ بجو۔ تمھارا کہا اور میں نہ مانوں؟" آفریں بولی۔" بولو بجیا۔ پہلی شرط۔"

"پہلی اور پچھلی کیا؟ بس ایک ہی تو ہے!۔"

عرض کرو۔ ہم گوش بر آواز ہیں۔

تمھیں تو ہوش ہی نہیں۔" برکہ نے کہا" نجانے کون سی دنیا میں مگن رہتی ہو۔ اتنا سوچا کہ ہم تقریبات میں آخر پہنیں گے کیا؟۔"

کیا مطلب؟۔ کیا پہنیں گے۔ ارے کپڑے پہنیں گے۔

بسنت کی خبر بھی ہے۔" برکہ نے آنکھیں چمکائیں، مسکرائی اور پھر کہیں سے ٹٹول کر بڑے نوٹوں کا ایک بنڈل برآمد کیا۔ "یہ دیکھو

"اتنے بہت سارے ۔۔۔!" آفریں اس کی خاطر للچائی۔

"جناب،" برکہ نے سر جھکایا "چچا میاں نے عنایت فرمائے ہیں۔"

"خواہ مخواہ؟"

"خواہ مخواہ دینے کے لئے ان کے پاس خارون کا خزانہ نہیں ہے۔ یہ تو ۔۔۔"

"خارون نہیں بھائی۔ قارون،" آفریں بولی۔

"ہوگا۔ نہیں جو آسان سا لگا۔ کہہ دیا!۔"

"شرط ابھی تک نہیں بتائی تم نے!"

"ارے ہاں۔ تمہاری فضولیات میں میرا دماغ بھی فیل ہو جاتا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ ابھی چلو میرے ساتھ باہر۔ چچا میاں نے کپڑوں اور دوسری ضروریات کے لئے پورے ڈھائی ہزار کی گرہ ڈھیلی کی ہے۔ چھ سات دن شادی کے باقی ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔ کپڑے لے آئیں!"

"مجھے بہت سا لکھنا ہے۔" برکہ ا۔

"شرط پوری نہیں کی۔ اب اٹھو اور بھابی کا کمرہ درست کر دو۔ میں اکیلی بازار چلی جاؤں گی۔ میں نے چچی بی سے کہا بھی تھا کہ آفریں میرے ساتھ نہیں چلے گی۔ وہی ہوا۔ رہنے دو۔ مت چلو!۔"

برکہ خفا ہو کر اٹھنے لگی۔ اور تبھی آفریں ہنس دی۔ برکہ کو سب لوگ بہت چاہتے تھے۔ اور کسی کو اس کی دل شکنی گوارہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیم یسیر تھی! آفریں کے چچا یعنی برکہ کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔

بیوی ناراض ہو کر میکے چلی گئیں۔ سال بھر کی برکہ کو باپ کے پاس چھوڑ گئیں۔ انھوں نے غصہ کے مارے بچی اس کی ماں کو نہیں دی بلکہ اپنی ماں کے حوالے کر دی بڑی بی نے ہزار کوشش کی کہ برکہ کو ماں سے محروم نہ کیا جائے لیکن برکہ کے باپ ڈاکٹر الطاف احمد کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ لہٰذا وہ مدتوں سے اپنے ددھیال میں رہتی آئی تھی۔ اس کی خبر نہ تو باپ نے لی نہ ماں نے۔ اور وہ خود دونوں میں کسی کے پاس جانا پسند نہ کرتی تھی۔ اسے صدمہ تھا۔ جب ماں باپ کو اس کی رتی بھر پرواہ نہیں تھی تو وہ ان کے پاس زبردستی کیوں جاتی۔ اب تو اس نے سنا تھا کہ الطاف صاحب کے تین چار بچے تھے اور باپ سے طلاق لے کر اس کی ماں نے بھی کسی ریٹائرڈ میجر سے شادی کر لی تھی!۔

وہ اتنی نیک، بھولی بھالی اور سب کی خدمت گذار تھی کہ اپنے پرائے سب اسے چاہتے اور پسند کرتے تھے۔ اس کی ٹریجڈی نے اسے اور بھی سب کا محبوب بنا دیا تھا۔ آفریں اسے بے حد چاہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی رازدار بھی تھیں۔

آفریں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ اور باہر نکلی۔

دیر نہ لگانا۔ جلدی چلی آنا" امی نے کہا۔ سامنے بڑے تخت پر خواتین میں گھری بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ چہرے سے مسرت چھلکی پڑتی تھی۔ چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی ہنس دیتیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد من چاہی ہو ملی تھی۔ اور بیٹا ایک فارن بینک کا برانچ منیجر بن گیا تھا۔ بہت سی دعائیں انکی ایک ساتھ قبول ہوئی تھیں۔ لہٰذا وہ بہت مسرور تھیں۔ ان کی خوشیوں میں نظر لگی جا رہی تھی!۔ آفریں نے ان کی طفلانہ مسرتوں کو بڑے ترحم آمیز انداز میں

دیکھا۔

برکہ نے آفریں کو دیکھ کر شوخی سے آنکھ دبائی اور امی سے بولی۔

"کچھ دیر اگر ہو جائے تو پریشان نہ ہوئیے گا چچی بی۔ یہ افلاطون کی خالہ اماں ساتھ ہیں۔ کپڑوں کا چوائس مشکل ہو جائے گا۔ پھر ادھر سے ٹیلر کے پاس جانا ہے اس کے بعد چوڑیاں، چپلیں۔ اور ــــ" وہ کچھ اور تفصیل بھی بتاتی لیکن امی نے گھبرا کر اسے روک دیا۔ "اچھا اچھا۔ مگر ذرا غفور میاں کو اپنے ساتھ رکھنا۔ گھر کا ایک بزرگ ملازم ساتھ ہو تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

گھر سے باہر کی فضا نے آفریں پر سے سنجیدگی اور ادبیت کی کینچلی اتار پھینکی یک بیک وہ مسرور ہو گئی۔ سڑک پر بڑی چہل پہل تھی۔ جس کسی کے چہرے پر اس کی نظر پڑتی، وہی متبسم نظر آتا عجیب سی زندگی یہاں وہاں متحرک تھی۔ رواں دواں قافلے در قافلے۔ اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ رہے تھے کہاں جا رہے تھے جیسے دیکھو بھاگا جا رہا تھا۔ نجانے کہاں نجانے کدھر۔ سب کو بہت ضروری ضروری کام تھے!۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ دوسرے پر سبقت لے جائے!۔ فٹ پاتھوں پر ہجوم، دکانوں میں گھما گھمی، بسیں کاریں، رکشے سب مسافروں سے بھرے ہوئے۔ ان سب کی منزل کون سی ہے؟ وہ بڑی دلچسپی سے اردگرد کا نظارہ کر رہی تھی! اور اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ یکبارگی برکہ نے ایک شوپنگ سنٹر پر رکشا ٹھہرا دیا۔

"اس کے بعد مجھو میں بریانی کھائیں گے"۔ برکہ ہنس دی۔ اسے تو کوئی بریانی کھلاتا تو وہ کھاتے کھاتے نہ تھکتی!۔

"پہلے اپنی خریداری سے تو نپٹ لو"۔ آفریں رکشے سے اتری اور دونوں ساتھ ساتھ شاندار دکان میں داخل ہوئیں۔ یہاں کی آرائش اور مصنوعات کی زیبائش

سے آفرین کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ رکیوں کی بلب روشن تھے۔ ان کا عکس بدصورت ساڑیاں
آئینوں میں پڑ رہا تھا۔ روشنی کو دوگنا تیز بنانے میں مدد دے رہا تھا۔ جگہ جگہ
بڑے بڑے نفیس سے پنکھے نصب تھے۔ نجانے کیسی کیسی نامانوس خوشبوئیں پورے ہال
میں چاروں طرف بکھر رہی تھیں۔ درمیانی لمبی لمبی چمکیلی خوشنما میزوں پر خریدار حضرات
و خواتین کے درمیان طرح طرح کے کپڑوں کا رنگین اور بھولدار انبار لگا تھا۔

ترنم کو اونچی جگہ لگ گئی۔ آفرین نے چپکے سے برکہ کو ٹھوکا دیا۔ ہمارے پاس
صرف ڈھائی ہزار ہیں اور یہاں ایک ساڑی کی قیمت ڈھائی ہزار ہو گی۔

ہائے چپ بھی رہو۔ برکہ بھی کچھ بدحواس تھی۔ اب تو آ ہی گئے ہیں۔ کچھ نہ
کچھ خریدنا پڑے گا۔ ورنہ ان سب میں ہماری سبکی ہو گی۔

تو پھر تم اپنے لئے کچھ لے لو۔ آفرین نے بڑی فراخدلی اور قناعت سے
کہا۔ مگر جواب میں برکہ صاف مکر گئی۔

"نہیں حاتم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔ بس خرید لیں گے۔"

آفرین کو بے حد ہنسی آ رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظریں چمکیلے شوکیسوں
پر پڑ رہی تھیں۔ بجلی کے شیشوں کے اندر جو دیدہ زیب اور مرعوب کن ساڑیاں
اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ وہ ان کی استطاعت خریداری سے بہت دور کی چیزیں
تھیں!

ہال میں ایک بڑا مہذب سا شور برپا تھا۔ دونوں کچھ سراسیمہ سی ایک گوشے
میں پڑی کرسیوں پر بیٹھی احمقوں کی طرح ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہی تھیں۔
دفعتاً ایک نہایت اپ ٹو ڈیٹ اور سنجیدہ سے سیلز مین آفرین کے پاس جھکے۔ وہ
چونک پڑی۔ پتہ نہیں کون ہے۔

فرمائیے۔ آپ کو کیا دکھاؤں؟" انھوں نے پوچھا اور پھر اپنی پیشہ ور زبان میں فر فر بجانے کن کن کپڑوں کے نام لئے کہ آفریں کی رہی سہی عقل بالکل خبط ہو گئی اسے دم بخود دیکھ کر برکہ اس کی کمک پر آئی! اور جلدی سے بولی۔

"ہمیں اچھی ساڑیاں چاہئیں! بھائی کی۔ جی ہاں۔ اپنے بھائی کی شادی میں پہننے کے لئے!"

آفریں نے ہنسی چھپانے کے لئے لبوں پر آنچل رکھ لیا۔

"ابھی دکھاتا ہوں!"

اگر ہمارے ڈھائی ہزار آٹے میں نمک نکلے تو میں یہیں بیہوش ہو کے گر پڑوں گی" برکہ نے کہا۔

میرے تو تن بدن میں سناٹا چھا رہا ہے!" آفریں اس کے کان میں گنگنائی اب دیکھنا تمہاری بدولت کیا دن دیکھنا پڑے گا!"

دفعتہً آفریں کے سامنے کچھ دور پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے پھڑ پھڑا کر اخبار الٹا۔ آفریں کی نگاہیں اُدھر اٹھ گئیں، اور وہ یکبارگی سمٹ گئی، وہ یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالر سرآراحمد خاں تھا اسکی شخصیت بڑی تہہ دار تھی اکثر اس کا سامنا یونیورسٹی کے اہم فنکشنوں میں ہوتا رہتا تھا۔ وہ نجانے کیا کچھ تھا۔ ریسرچ اسکالر، یونین کا صدر، میگزین کا ایڈیٹر، وائس چانسلر کا دوست بڑا مقرر، بہترین مصنف، اور نجانے کیا کیا۔ آفریں نے کئی بار دیکھا تھا کہ وہ بے حد لمبی چمکیلی گاڑی میں آتا تھا۔ لوگ اس سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اس کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ وہ بڑا مغرور، مردم بیزار، اور کم گو انسان تھا۔ نجانے اسے اپنی بر۔ قار شکل، لمبے چوڑے پُرکشش جسم کا غرور تھا یا اپنی

امارت کا احساس تھا کہ وہ کبھی کسی سے سیدھے منہ نہیں بولتا تھا۔ بس کام کی بات
اسے صنفِ نازک سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ یونیورسٹی کی "اولڈ اور ینگ" جتنی بھی
لڑکیاں تھیں۔ سب اس کے قرب کی متمنی رہتی تھیں۔ لیکن سنا تھا کہ اس
نے کبھی کسی کو لفٹ نہ دی تھی۔ اتنا اکھڑ، کھرّا اور بددماغ تھا وہ۔

آفریں کو آج تک اس سے رسمی سی بات چیت کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔
بھلا وہ کون سی گری پڑی لڑکی تھی جو خواہ مخواہ دانت نکال کے ایسے وحشی
بدمزاج انسان سے بات کرتی اور آپ اپنی توہین کا باعث بنتی۔ ایسے تو اس
مغرور آدمی سے کسی قدر چڑھ تھی۔ آخر اس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے!۔
آفریں نے رخ پھیر لیا اور ان ملبوسات کی طرف متوجہ ہو گئی جو سیلز بوائے
میز پر رکھنے لگا تھا!۔۔

زرام نے ایک نظر آفریں پر ڈالی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شناسائی
کی لہر سی آ کے گزر گئی!۔ وہ گونجدار آواز میں کھنکھارا اور اپنے چہرے کے آگے
دور دور تک اخبار پھیلا لیا تھا۔

اب آفریں کچھ پریشان ہونے لگی تھی۔ اس کی تمام گفتگو وہ اچھی طرح
سننے لگا۔ ان کا مول بھاؤ، قیمت پر اصرار و تکرار، سب اسے معلوم ہو جائے گا۔ وہ
چپ تھی۔ برکہ البتہ ایک ماہر خریدار کی طرح نفیس و قیمتی ساڑیاں الٹ پلٹ
رہی تھی!۔

"آپ ان میں سے انتخاب کیجئے"۔ سیلز بوائے نے کہا۔ "میں تب تک
اور لاتا ہوں"!

"بولو نا۔ کون سی اچھی ہے"! برکہ اس کے پاس جھکی۔

"برکہ؟"

"ہوں۔"

"وہ۔ وہ جو۔ سامنے ایک صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں!"

ہاں ہاں" برکہ کی نظر ادھر اٹھ گئی۔

"وہ ہماری یونیورسٹی میں اسکالر ہیں۔ مجھے پہچانتے ہیں!"

"تو کیا؟" برکہ حیران تھی۔

"میں اس آدمی کی موجودگی میں نروس ہو جاتی ہوں۔"

"بے وقوف ہو تم۔ ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ کون سی ساڑی پسند آئی ہے؟"

آفریں نے ایک لمبی سی سانس لی۔ سچ ہے اسے ان سے کیا لینا دینا۔ جی کو قابو میں کر کے وہ آگے جھک آئی اور بے حد دلچسپی سے ساڑیوں کا انتخاب کرنے لگی۔ اتنے میں سیلزمین نے ڈھیروں اور سامنے لا رکھیں۔

قیمت معلوم کی گئی۔

برکہ نے دو ساڑیاں الگ کیں۔ سیلزمین نے قیمت بتائی۔

"یہ سترہ سو کی ہے اور وہ پندرہ سو کی۔"

"جی؟" برکہ اچھل پڑی "یہ تو بہت گراں ہیں۔"

"اس سے کم قیمت کی کوئی دکھائیے" آفریں نے کہا۔

"نہیں! بے صاحب" اس نے معذرت کی "یہی سب سے کم دام کی میں نے آپ کو دکھائی ہیں۔ دوسری تو اس سے زیادہ مہنگی ہیں۔ یہ شہر کا سب سے بڑا کپڑا ایمپوریم ہے جناب!"

دفعتہً ضرار نے اخبار تپائی پر رکھ دیا اور یکبارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بے اختیار آفرین اسے دیکھنے لگی۔ اور پھر بے اختیار ہی سلام کی خاطر اس کا ہاتھ پیشانی سے جا لگا۔ وہ درست تھے۔ وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ کچھ بولے بغیر فرزاد نے بھی اسی طرح پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑا ہال سے نکل کر چلا گیا۔

آفرین نے اطمینان کی سانس لی۔

"تو پھر صاحب؟" سیلز بوائے نے کہا۔

"ہم کسی اور جگہ دیکھتے ہیں۔" برکہ بولی اور اٹھنے لگی

دفعتہً اسٹینڈ پر رکھا ہوا ٹیلی فون بج اٹھا۔

"چلو چلیں۔ خواہ مخواہ اتنا وقت خراب ہوا۔ اُدھر چچی بی نے جلدی آجانے کی تاکید کی تھی۔" برکہ نے کہا۔ آفرین بھی اٹھ گئی تھی۔ دونوں دبیز قالین پر ٹہلنے کے انداز سے چلتی اور تفریحاً ادھر ادھر دیکھتی ہوئی باہر جا رہی تھیں کہ وہی سیلزمین صاحب بھاگ کر ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" برکہ ڈر گئی

"معاف کیجیے، مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں یہاں ابھی نیا نیا آیا ہوں۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "ان ساڑیوں کی قیمت میں نے آپ کو غلط بتائی تھی۔ آپ ادھر تشریف لائیے۔ میں ان کی صحیح قیمت آپ کو بتاتا ہوں۔"

"سچ؟" برکہ پھولی نہ سمائی۔

"جی ہاں" وہ مؤدبانہ انداز میں مسکرائے۔

وہ پھر واپس پلٹیں۔ پھر انھیں بتایا گیا کہ وہ دراصل سات سو اور پانچ سو کی قیمت کی ساڑیاں تھیں۔ بڑی خوشی سے دونوں نے ساڑیاں خریدیں اور

بیچد مسرور سی باہر آئیں۔ پھر جب تک ان کا رکشا دور موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ سیلز مین کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر مڑا اور دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا!۔

دونوں بہت خوش تھیں۔

مغرب تک انھوں نے اپنا سارا سرمایہ ختم کر دیا۔ اور لدی پھندی گھر کی طرف ہو لیں۔ راستے میں دفعتہً آفریں نے برکہ کو چپکے سے ٹہوکا دیا۔

"وہ دیکھو!"

کیا ؟۔ وہ لمبی سی کتھئی رنگ کی گاڑی؟" برکہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

ہاں! آفریں کا رکشا جب کار کے پاس سے نکل کر آگے بڑھ گیا تو وہ بڑے فخر سے بولی "یہ ہمارے ایک ساتھی کی کار ہے۔ بہت بڑے آدمی سمجھتے ہیں۔

تمھاری کلاس میں ہیں شاید؟" برکہ کچھ مرعوب ہو کر بولی۔

نہیں تو" آفریں نے جواب دیا۔ وہ کب کی تعلیم ختم کر چکے ہیں۔ شاید اب ریسرچ کرتے ہیں۔ سچ برکہ۔ استاد صاحبان تک ان سے مرعوب رہتے ہیں!"

ہاں آج کل مرعوب کرنے والی چیز صرف اپنے زر سے اونچی دولت ہی ہے۔ تعلیم، نسلی برتری، یا ذاتی شرافت مرعوب کرنے والی باتیں نہیں ہیں۔"

تم سمجھیں نہیں بھئی۔" آفریں مسکرائی۔ "وہ بے چارہ بہت سیدھا سادھا کم سخن اور کم آمیز آدمی ہے۔ لوگ بس اس کی خاموشی علمی متانت اور گوشہ نشینی کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ یقین کرو۔ جب صبح اپنی کار سے اترتا ہے تو

بزرگی کی مناسبت سے نصیحت کی۔

دونوں چپ ہو گئیں۔

گھر پہونچ کر بڑکہ تو سب کو اپنا خریدا ہوا سامان دکھانے لگی۔ اور آفریں اپنے کمرے میں آئی۔ پیچھے سے چھوٹے بھیانے آواز دی۔

"تمہارے نام کوئی رسالہ اور ایک خط آیا تھا۔ میز پر رکھ دیا ہے"

خط کا نام سن کر آفریں کے دل میں خفیف سی چبھن ہوئی۔ اس نے بھاگ کر باقی راستہ پورا کیا۔ اور کمرے میں پہونچکر خط پر جھپٹا مارا۔

پھر وہی خط۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہونے لگے اور دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔

آفریں ادبی حیثیت سے جانی پہچانی ادیب تھی۔ اس ملک کے مختلف مؤقر رسائل میں لکھتے ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اپنی صاف ستھری اور پاکیزہ تحریر سے اس نے ادبی حلقہ میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ نقادوں کا اس کے متعلق کہنا تھا کہ وہ ایک واحد قلم کار تھی جس نے حصول شہرت کے لئے جنس اور عریاں نگاری کا مطلق سہارا نہیں لیا تھا بلکہ کئی بار وہ اپنے خیالات کا اظہار کر چکی تھی کہ اسے جنس زدہ ادب و ادیبوں سے نفرت تھی اس کی ادب کا دشوں کا اکثر موضوع ہوتا تھا! وہ گھریلو مسائل اور ہلکے پھلکے رومانی ادب کی قائل تھی، اور اس کی دانست میں ادب خاص برائے زندگی تھا۔ آدمی اگر تحریری کاوشوں سے کچھ نہ سیکھے تو پھر

خامہ فرسائی کا حاصل ہی کیا! ۔ بہر حال وہ ایک عمدہ قلم کار کی حیثیت سے اُبھر رہی
تھی اور اس کے اعلیٰ و روشن مستقبل کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی!۔

اکثر اسے اپنے افسانوں کی پسندیدگی کے سلسلے میں اِدھر اُدھر سے خط ملتے تھے
جن میں مسلسل تعریف و ستائش ہوا کرتی! آفریں اب ان خطوط کی اتنی عادی ہو چکی
تھی کہ اس کے نزدیک تعریف و تنقیص کی قطعی اہمیت باقی نہیں رہی تھی!۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے سے وہ عجیب الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ اس پوشیدہ الجھن
کا حل وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ حل اس کے بزرگوں کے پاس بس
یہی ہوتا کہ اسے اس کی قلمی دل چسپیوں سے یکسر محروم کر دیا جاتا۔

ابا جان نہ صرف بلکہ "خالص" مشرقیت پسند اور قدامت پرست تھے۔ وہ فوراً
اس کے قلم پر پابندی لگا دیتے اور امی تو شاید اپنی قسم رکھا دیتیں۔ جب کہ وہ پڑھی
اور بے حد ڈرپوک خاتون تھیں۔ انھوں نے تو اس کا مردانہ یونیورسٹی میں پڑھنا ہی
گوارہ نہ کیا تھا۔ یہ تو اس نے بھائی جان کے ہاتھ پیر جوڑ کر امی کو راضی کر لیا تھا۔
اور اب وہ ہمیشہ ڈرتی ہی رہتی تھی کہ کہیں کوئی ایسی خفیف سی بات بھی نہ ہو جائے
جسے بتنگڑ بنا کر امی اسے گھر بٹھا لیں۔ اس لئے خود کو بے حد محتاط اور حد درجہ لئے
دئے رہتی۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کو خیر اس نے کبھی مخاطب بھی نہیں کیا بلکہ وہ شوخ و
نیم ترقی پسند اور بے باک لڑکیوں سے بھی دور ہی دور رہتی۔ اسے خوب پتہ تھا کہ ہر
لڑکی اور لڑکے کا اسکینڈل یونیورسٹی میں "چالو" تھا۔ اور وہ لوگ اپنی اس
سستی شہرت اور گھناؤنی پرستاری سے خوش و مطمئن بھی تھیں! آفریں تو محبت
کے تصور سے الرجک تھی!۔

پہلے پہل جب اسے ایک خاص خط ملا۔ جو ہلکے نیلے رنگ کے دبیز چکنے اور عمدہ

آپ کا جواب چاہتا تو ہوں۔ اور اکثر سوچتا ہوں کہ آپ مجھے کیا لکھیں
دیا لکھیں گی، یا نہیں؟ مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں کہ آپ میری
ناچیز تحریر کو در خود اعتنا سمجھتی ہیں کہ لفافہ پر مخصوص تحریر دیکھ کر
ردی کی نذر کر دیتی ہیں۔ بہرحال کچھ بھی کہیے۔ میرا مسلک تو بقول
غالب یہی ہے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

دینے اپنا دل چیر کے آپ کو کیسے دکھاؤں ؎

تمنا تری ہم نشینی کی ہے
بس اک ساعت مختصر کے لئے

میں گستاخ حد ادب سے آگے تو نہیں بڑھ رہا ہوں؟ آپ کی خفگی
جبیں پر ناگواری کی شکنیں ہیں۔ خدا کی قسم میں آپ کو ملول کرنا پسند
نہیں کرتا۔ اچھا پھر کبھی۔

خدا حافظ۔ آپ کا ا۔

اور یہ بے خود آفریں کے لئے عذاب بنتے جا رہے تھے۔ وہ کون تھا۔ کیا تھا؟
کہاں رہتا تھا۔ نہ اس نے کبھی اپنا نام لکھا نہ پتہ درج کیا۔ لفافہ پر ثبت کی
ہوئی مہر سے صرف اتنا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اسی شہر کا رہنے والا تھا۔
لیکن مہر پوسٹ آفس کی ہوتی تھی۔ اس سے بھلا کیا پتہ چلتا؟
آفریں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کاتب کا مقصد کیا تھا۔ محض اسکی تعریف
حوصلہ افزائی۔ یا پھر کچھ اور۔
کبھی کبھی تو خط میں تحریر ہوتا۔

آپ اپنے سفید پاکیزہ لباس میں لپٹی یونیورسٹی آئیں میں دور سے آپ کو دیکھتا رہا اور میرے دل و دماغ میں عقیدت و محبت کے ہالہ بلند ہوتے رہے۔ اس مسموم فضا میں صرف آپ کو دیکھا جس پر تقدس، عظمت، نسائیت کا غرور اور پاکیزگی کا نور، حیا و عصمت کی روشنی نچھاور ہو رہی تھی۔ زہے نصیب۔ آپ میرے پاس سے گزر گئیں اور میں دور کھڑا آپ کو سیمینار میں جاتے دیکھتا رہا۔ کیا ہوتا اگر میں آپ کو مخاطب کر لیتا۔ آج تک اس کی جسارت نہیں کی۔ آپ اپنی عظمت منوانا جانتی ہیں۔ خدارا میری خاطر ایک بار پھر وہی لباس پہن کے آئیے۔ آپ کا ...

اس قسم کے خط وہ الماری میں مقفل کر دیتی۔

آج آپ کی نئی کہانی "مسرتوں کے مزار"، پڑھی۔ اللہ اللہ۔ آپ اس میں اتنی نمایاں ہیں کہ مجھے ایسا لگا جیسے آپ کے اور میرے درمیان پڑا ہوا سیاہ پردہ اٹھ گیا ہو۔ مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے

مصنف کتابوں میں چہرہ نما ہے

ایسی دل گداز و جانگسل تحریر نہ لکھا کیجئے کہ پڑھنے والے کا دل خون ہو کے آنکھوں سے بہہ نکلے۔ بہت بہت مبارکباد۔

آپ کا ...

آفریں کے شب و روز عجیب سی بے چینی کی نذر ہو گئے۔ اس کی نیندیں حرام رہنے لگیں۔ دن عذاب ہونے لگے۔ کیا ہو گا اگر اس قسم کا کوئی خط اباجان

یا بھائی جان کے ہاتھ لگ جائے گا۔ یہ تو ان دونوں کا اس پر مکمل اعتماد ہے کہ وہ
کوئی خط پڑھ نہیں لیتے۔ اگر کبھی پڑھ لیں تو۔ اگر انھیں کبھی خیال آجائے کہ دیکھیں
آفریں کے پرستار اسے کس قسم کی تحریر لکھتے ہیں تو پھر ــــ؟ اور اس خیال کے
بعد آفریں کے ہر بن مو سے سرد پسینہ بہہ نکلتا! ۔ کیا سوچیں گے ابا جان؟ آفریں
کو اس قسم کے خط ملتے ہیں؟ ۔ وہ ان کی نظروں سے گر جائے گی۔ ابا جان ضرور
سوچیں گے کہ آفریں نے ان کے اعتماد، بھرم اور محبت کا قطعی غلط فائدہ
اٹھایا ہے۔ وہ جو خود کو عام لڑکیوں سے بلند و مختلف ہونے کا دعویٰ کرتی ہے،
وہ تو عام لڑکیوں کی سطح سے بھی نیچی ہے۔

اس نے اپنی یونیورسٹی میں غائرانہ انداز میں لڑکوں کا جائزہ لیا، کوئی ایسا
تھا جو اس کے ساتھ ایسا سنجیدہ مذاق مسلسل کرتا رہتا؟ مگر نہیں۔ کسی نے
کبھی بھولے سے بھی اس کے کسی شہ پارے کی تعریف نہیں کی تھی!
لڑکیوں میں اتنی ذہانت اور جمالیاتی حس نہ تھی جو وہ ایسی شرارت کر سکتیں
تو پھر ــــ؟

سب سے بڑی الجھن جو آفریں کو بے چین کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ان مبہم
اور گمنام خطوط کا تذکرہ وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھی! خاموش رہنے میں
خطرہ۔ ظاہر کرنے میں رسوائی۔ اس پر الزام آتا ابھی تک اس نے رازداری
کیوں برتی تھی؟۔

وہ بڑے سخت کرب سے گزر رہی تھی!۔ اگر خط لکھنے والے نے اپنا پتہ لکھا
ہوتا، نام ظاہر کیا ہوتا تو وہ بڑے ادب سے گزارش کرتی کہ خدا کے واسطے
اس کا پیچھا چھوڑ دیا جائے۔ مانا کہ اس کی تحریر شرافت سے تجاوز نہیں کرتی۔

لیکن نام اور پتہ کی پوشیدگی یہی ظاہر کرتی تھی کہ لکھنے والے کی نیت صاف نہیں تھی؛

اور اب ——— یہ تازہ خط۔

آفریں کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن بے چین کرنے والی تھی۔ لب خشک ہونے لگے تھے!۔

خدا مجھے کسی عذاب میں مبتلا نہ کرے!۔

اس نے دعا مانگی۔

اور اٹھ کر پردہ برابر کر دیا۔ کہ ہمیشہ بجو چھلاوے کی طرح آجایا کرتی تھی؛ گھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا!۔

اس نے چپکے سے لفافہ چاک کیا۔ اور خط نکالا۔ ہمیشہ کی طرح جوہی زرد گلاب کی پتیاں اس کی گود میں گریں۔ وہ یوں چونکی جیسے کاغذ کے اندر سے سانپ نکل کر اس کی آغوش میں آ گرے ہوں!۔

جانے کون سا پوشیدہ ربط اسے ان پتیوں سے تھا کہ وہ اپنے دلی تکدر کے باوجود انھیں دامن سے جھٹک کے پھینک نہ سکی!۔ احتیاط سے چن لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ خط کھلا اور مانوس سی دھیمی دھیمی مہک نے ناقابل فہم سے جذبے اس کے دل میں جگا دیے۔ آدمی اپنے تمام محسوسات کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ وہ اپنی نفسیات سے بھی بے خبر ہوتا ہے؛

اس نے خط کھولا۔

بڑی خوشی ہوئی اس خبر سے کہ آپ اب کی یونیورسٹی میگزین میں اپنا طویل مختصر افسانہ دے رہی ہیں۔ ابھی سے اشتیاق و اضطراب کے جذبے مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں

مگر آپ کی دلکش پاکیزہ اور معصوم سی تحریر مجھے کتنی پسند ہے۔ میں
نے آپ کے تمام افسانے ساری کہانیاں، اور چھوٹی سے چھوٹی تحریر
بھی اکٹھا کرتی ہے۔ یہ سب میرا سرمایہ حیات ہے۔ یہ ہمارا اور
عزیز جان ہے۔ شاید کبھی ایسا ہو جائے کہ میں اپنے قیمتی ادبی سرمایہ
دونوں ہاتھوں میں لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ اس
امید کے ساتھ کہ آپ اپنے جادو نگار قلم سے میرے خزانے پر اپنے
دستخط کر دیں۔ اور پھر جب میرا آخری وقت آئے۔ مجھے اپنی قبر
میں لٹایا جائے تو میں وصیت کر جاؤں کہ یہ سب چیزیں میرے ساتھ
ہی قبر میں دفن کر دی جائیں۔ ارے! آپ نے برا سا منہ بنا لیا ہے
چلئے میں ایسی نامبارک باتیں پھر کبھی نہیں کروں گا۔ ابھی تو مجھے
جینا ہے۔ بہت دیر تک جینا ہے۔ آپ کے سحر آفریں افسانے
پڑھنے کے لئے۔ اچھا تو پھر آپ کب تک اپنے شمارے کہانی میگزین
بتا رہی ہیں؟ ۔ آپ کا ۔"

خاک پڑے تمہارے منہ پر۔ وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔ آپ کا۔ آپ کا خواہ مخواہ
میرا بن بیٹھا ہے۔ ہائے کیا مجھے سب میں رسوا کر کے دم لے گا۔ اس بدمعاش
کو کیا خبر کہ میں میگزین میں کچھ لکھ رہی ہوں۔ سچ سچ میرا جی مجھے اُلٹا رہا ہے
خدا نے مجھے کہاں کہاں کس حال میں دیکھتا رہا ہوگا۔ اور میری پریشانیوں پر
خوب ہنستا ہوگا؟۔

کیا کروں ۔۔ کیا کروں!۔

باہر کسی کی چاپ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے خط پر پنکھڑیاں رکھیں

اور لفافہ جلدی سے اپنی الماری کی تجوری میں مقفل کر دیا۔ پھر واپس روشنی کے نیچے آبیٹھی اور تازہ رسالہ کھول کر دکھاوے کو ورق گردانی کرنے لگی۔ ویسے وہ اپنے چہرے سے فکروں کے آثار چھپانے میں بالکل ناکام رہی تھی!

دوسرے لمحے پردے سے سر نکال کر برکہ نے جھانکا۔ اور اسے اپنے مشغلے میں غرق دیکھ کر اس نے غصے سے دانت پیسے۔

کیوں؟ کیا بات ہے۔" آفریں نے بناوٹی خوشدلی سے پوچھا:

"میں سمجھتی ہوں آفریں کہ تم تھوڑے دنوں بعد وہ عظیم چوپایہ بن جاؤ گی جو ردّی بڑے شوق سے کھاتا ہے!" برکہ نے کہا۔

آج دوپہر ہی سے تم پر غصہ چڑھ رہا ہے۔ کیا بات ہے؟۔ آفریں نے پرچہ الگ اچھال دیا۔ اور ہنسنے لگی۔

برکہ اندر آئی اور بیزاری سے بولی۔ چچی بی کا خیال ہے کہ انھوں نے تمھیں ناجائز آزادی دے رکھی ہے۔ تم اپنا لڑکی پن بھول گئی ہو۔ تمھیں گھر بار سے اور گھر کے رہنے والوں سے بھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا تمھیں سزا دینے کے لئے وہ تمھیں کالج سے بھی اٹھالیں گی اور تمھارے نگوڑے افسانوں کو بھی آگ دکھادیں گی۔ کہہ رہی تھیں کہ جس گھر کی شریف عورتوں نے بہشتی زیور اور توبۃ النصوح سے آگے نہ بڑھا ہو اس گھر کی لڑکی محبت کی کہانیاں لکھے غضب ہے غضب خدا کا غضب!۔ سو میں نے تمھیں خبردار کر دیا۔ انھیں سخت غصہ ہے کہ اللہ رکھے بڑے بھائی کی شادی ہے اور تم ــــــــ!۔

بس بس بس!۔ آفریں نے گھبرا کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا!۔ تم نے مجھے خبردار کر کے اپنی جنت خرید لی۔ میں اب گھر کا سارا کام کروں گی۔

چلوں باہر!"

آفریں؟؟؟

کیا!!!

دیکھو میری طرف!

کیوں۔

دیکھو تو۔

لو دیکھ رہی ہوں"

تمھاری یہ بسورتی ہوئی مسکراہٹ مجھے اچھی نہیں لگتی آفریں۔

ہر کہ تم نے پہچان لیا کہ میری مسکراہٹ بسور رہی ہے؟۔

ہاں آفریں۔ بولو کیا بات ہے۔ کیا مجھ سے بھی تمھاری کوئی پریشانی چھپی رہے گی!۔

نہیں تو۔ واہ۔ خواہ مخواہ۔ میں پریشان کہاں ہوں۔

اچھا نہ بتاؤ۔ میں اس قابل کہاں آفریں۔ تمھاری پریشانیوں میں تو وہ لڑکیاں حصہ لیں گی۔ جو تم سے قریب ہیں!۔

بس خفا ہو گئیں پاگل۔۔ آفریں کھسیا کر ہنسی۔

چچی بی نے کھانا کھانے کے لئے بلایا تھا۔ ہر کہ اٹھنے لگی۔ اور جو باتیں میں نے ابھی کہی تھیں۔ وہ چچی بی نے نہیں کہی تھیں۔ میں نے ان کی طرف سے۔۔۔!

تم میں یہ بڑی خرابی ہے کہ تم بس منٹ بھر میں بگڑ جاتی ہو۔ بیٹھو تو کہوں کیا پریشانی ہے؟" آفریں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہر کہ پھر بیٹھ گئی!۔ مگر متذبذب لہجے میں بولی:۔

چچی بی ہمارا انتظار کرتی ہوں گی!۔
اچھا میں پھر کہوں گی" آفریں نے کہا۔
کیا سچ مچ کوئی بات ایسی ہے آفریں کہ تمھارے چہرے پر منجمد ہو گئی ہے؟:
"ہاں برکہ!"
خدا نخواستہ یونیورسٹی کا کوئی بدمعاش لڑکا ــــــ!!
نہیں نہیں۔ایسی کوئی بات نہیں!"
کھانے کی میز پر بڑا بوجھل ہو رہا۔ برکہ کے ڈیڈی ڈاکٹر الطاف نہ جانے کیسے چلے آئے تھے۔ان کی موجودگی میں برکہ بہت جھینپی جھینپی سی رہتی۔وہ بڑے سنجیدہ کسی قدر غصیلے اور سخت گیر آدمی تھے۔ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی برکہ کو اپنی ماں کی یاد آجاتی۔اور اسے حسرت آمیز حیرت ہوتی کہ ماں باپ کے رکھتے ہوئے بھی وہ ان کی محبت اور شفقت سے محروم تھی!۔
الطاف میاں! شادی کے دن تو تم اپنی بیوی کو لاؤ گے!" امی ان سے کہہ رہی تھیں!" یا پھر کوئی دل لگتا بہانہ سوچ رکھو گے؟"
آپ حضرات اگر پسند کریں تو بھابی!۔" ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صاحب نے اب بھی بڑا معاندانہ اور بیگانہ سا جواب دیا۔
دیکھو بھائی! اس خوشی کے کاج میں تم لڑائی کی باتیں تو کرو نہیں!" امی نے جلدی سے کہا!" ہم نے کب تمھاری دلہن سے ملنا پسند نہ کیا۔تم البتہ اپنی مرضی پر چلے۔کبھی نہیں چاہا کہ انھیں ہفتہ بھر ہی ہمارے پاس رہنے کا موقعہ ملے۔اب تو سب ایک شاخ کے پھل پھول، ہوتے ہوئے بھی الگ الگ اور غیر ہیں۔انھیں بھی یہی شکایت ہے کہ آج تک کسی چھوٹی موٹی تقریب یا بڑے جشن

جی چاہے نہ آئے۔ بس۔

ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی چلے آئیں؛" الطاف صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا؛ "لہذا اماں بی کی پسند پر میری پسند حاوی نہیں ہو سکتی۔ انہی کو آنے دیجئے، جو فی الحال خاندان باہر ہیں!"

پھر دہی طعنہ دیا تو نے خانہ خراب؛" دادی اماں بپھر اٹھیں؛ "تو نے بھی تو سڑی ہوئی نالی میں منہ دیا ہے پھر تو خاندان باہر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی جوانی کا سہارا تلاش کر لیا تو تیرے کیوں مسرچیں لگی جا رہی ہیں۔؟"

بھائی صاحب!" الطاف صاحب نے احتجاجاً بڑے بھائی کی دہائی دی، اور میز سرکا کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

اماں بی خدا کے لئے بات نہ بڑھائیے؛" اوصاف صاحب بھی گھبرا گئے۔

مجھ پر شامت تھی۔ میں نے یہ تذکرہ ہی ناحق چھیڑا؛" امی نے کہا۔

بس اب چلا جا۔ کھڑا کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے؛" دادی اماں نے الطاف صاحب سے کہا۔

جا ہی رہا ہوں اماں بی۔ رہنے نہیں آیا؛" الطاف صاحب نے کہا۔ اور مڑ کر لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے طعام خانے سے نکل کر چلے گئے۔

دو لمحوں تک وہاں سناٹا چھایا رہا۔

پھر دادی اماں کی بوڑھی سسکیاں سنائی دیں۔

اماں بی؛" امی کی پشیمان سی آواز گونجی۔

یہی ہے نگوڑی اولاد؛" اماں بی نے کہا۔ "اسی کے لئے سجدوں میں

پیشانی رگڑتے ہیں، درگاہوں میں گھگھیاتے ہیں، خون پانی ایک کرتے ہیں کہ ہاتھ منہ کی ہو کر جنم جلی اولاد بدھی ماں کا کلیجہ چبائے۔ دلھن، تم ہرگز ہرگز اس کی دلھن اور بچوں کو مت بلانا۔ میں بے چاری غم نصیب ہاجرہ کو بلاؤں گی۔ اس کا دل کیا نہ تڑپتا ہوگا۔"

اچھا اماں بی۔ آپ کی جیسی مرضی۔" امی نے جلدی سے انھیں نارمل کر دیا۔ لیکن آپ دل بھاری نہ کیجئے۔"

پتھر دل یزید اگر میری گود میں سر رکھ کے معافی مانگ لیتا تو کیا میں اسے سمیٹ نہ لیتی۔" دادی بی بولیں "مگر وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا ہے تو میری جوتی کو بھی کیا پڑی ہے جو ——— !"

اماں بی یہ کھیر لیجئے۔" امی نے جلدی سے کہا۔ اور انھیں کھانے میں مشغول کر کے بحث اور بڑبڑاہٹ کا دروازہ بند کر دیا۔

اتنے میں پھوپھی جان اپنے دالان سے نکلیں انھیں یہاں کی چپقلش کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ بڑی خوش مزاج، زندہ دل اور کھلنڈری سی تھیں ماحول کی سنجیدگی کو سمجھے بغیر بولیں۔

"ارے تم لوگ کتنی مردہ دل ہو۔ برکہ، آفریں، تمھارے بھیا کی شادی ہے۔ سہیلیوں کو اکٹھا کرو۔ ڈھولک بجاؤ، سہرے گاؤ۔ یہ گونگی بہری کیسی شادی ہے بھئی!"

ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ جب تک گھر میں شور و غل نہ ہو۔ شادی کا لطف ہی نہیں آتا۔" اوصاف صاحب نے کہا۔

میرے کمرے میں دیوار پہ ڈھولک ٹنگا ہے۔ بھاگ کے لے آؤ۔"

وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی برکہ سے بولیں "ادھر سے اسفانی ماں کی لڑکیوں اور بہوؤں کو آواز دیتی آنا۔ نہیں شادی کے بہت سے گیت یاد ہیں!"

برکہ بوجھل دل لئے چلی گئی۔

سب طعام خانے سے نکلے۔ اور آفریں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی سے بجھے ہوئے بد دل اور افسردہ سی اپنے کمرے میں آگئی۔

ساری رات چھوٹی جان نے کسی کو سونے نہ دیا۔ ڈھولک بجتی رہی۔ لڑکیاں دلکشی گیت گاتی رہیں۔ برکہ زبردستی بھائی جان کو بھی کھینچ لائی۔ وہ سونے سوتے آنکھیں ملتے ہوئے آدھے کے لڑکیوں میں آبیٹھے۔

یہ زبردستی تو اچھی نہیں ہے چھوٹی جان" انھوں نے فریاد بلند کی۔ سب بچے ان سے بہت بے تکلف تھے۔ چھوٹی جان ابھی نو عمر حسین و سنجیدہ اور خوش اطوار نہیں تھیں۔ کم عمر اور شریر سی ہنس مکھ دادا خاتون تھیں۔

سنو اب ہم گیا رہے ہیں" انھوں نے کہا اور تالیاں بجا بجا کر لڑکیوں کے ساتھ گانے لگیں۔

بھائی ہمارے ہو گئے بھابی کے دیوانے ۔ اللہ
بھابی کو ہمارے نئی ساڑی کی بھی مہانے
بھائی ہمارے ہو گئے آنچل کے دیوانے ۔ اللہ
بھابی کو ہماری ٹیکہ بھی مہانے
بھائی ہمارے ہو گئے صورت کے دیوانے ۔ اللہ

اماں آخر اور کتنا دیوانہ ہوں گا؟" بھائی جان کانوں پر ہاتھ رکھ کر۔

اور بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ لڑکیاں قہقہوں میں ڈوب گئیں۔

دوسرے دن امی نے آفریں کو اس کی خواہش پر چند کارڈ دئے کہ وہ اپنی سہیلیوں کو پروفیسروں کو دے دے!۔

گھر کے بڑبونگ میں وہ اپنی الجھنوں کا حال ہر کہ سے نہ کہہ سکی!۔

• صبح روشن اور چمکیلی تھی۔ سورج کی اولین کرنوں میں سرخ بڑی چمک رہی تھی۔ یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں میں ہوا کی اٹھکھیلیوں سے ترنم پیدا ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کی دلچسپ اور دلکش زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔ ہوسٹلوں سے لڑکے آپس میں ہنستے قہقہے لگاتے کلاسوں کی طرف چلے آرہے تھے۔۔ ایک طرف کاروں کی قطار تھی۔ کینٹین میں ہجوم تھا۔ اور کافی چائے کی ملی جلی خوشبو فضا میں چکراتی پھر رہی تھی۔

بارودیڈور کی سنگی منڈیر سے ٹیک لگائے بجانے کب سے آفریں کھڑی تھی۔ اسے غیرارادی طور پر کسی گاڑی کا انتظار تھا! اس کی نظریں اسی جانب نگراں تھیں، جہاں سے کاروں کا ایک کارواں سا چلا آرہا تھا! وہ دیکھ رہی تھی کہ کیسے کیسے اپٹوڈیٹ طالب علم قیمتی گاڑیوں سے اتر رہے تھے۔ ان کے ملبوسات سے لپٹ کر اس تک آنے والی ہوا ایک طرح طرح کی جذبات خیز خوشبوئیں اسے نئے جہانوں کی سیریں کرا رہی تھیں۔ وہ بے حد معنی خیز نگاہوں سے ان کا جائزہ لے رہی تھی!۔

بتا نے ان میں سے وہ کون ہے؟۔

کون؟۔ اس کا دل دھڑکا۔

اس کے پاس سے بھی بہت سے لڑکے گزر رہے تھے۔ کئی ایک نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا بھی تھا!۔ لیکن اتنا تو شعور آفریں کو تھا وہ کس کی معنی خیز چور نظریں پہچان سکتی!۔

پھر یک بیک اس کے ذہن چلنے لگے۔ پتہ نہیں کون ہوگا وہ۔ جو اس کی تمام باتوں کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ اور اس کی ادبی مصروفیات سے واقف تھا!۔ اپنی لاعلمی میں وہ جانے کیا حماقت انگیز پروگرام سٹ کرتی تھی۔ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ وہ کون تھا تو پھر وہ چانسلر صاحب سے اس کی شکایت کئے بغیر نہ مانتی!۔

حد ہے تنگ کرنے کی!۔

وہ جھنجھلا گئی۔ اس کی بیوقوفی پر وہ اپنے دوستوں میں بیٹھا مزے لے کر اس کا تذکرہ کرتا اور ہنستا ہوگا!۔

ابھی کلاسیں شروع نہیں ہوئی تھیں اور اس کا پہلا پیریڈ فری تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنا نامکمل افسانہ مکمل کر لے۔ پھر پروفیسر صاحب بلا بھیجیں گے۔

یکایک اس کی نگاہیں دور موڑ پر پڑیں۔ جہاں سے مخصوص کتھئی رنگ کی شاندار کار یوں چلی آرہی تھی جیسے ہواؤں پر پرندہ تیر رہا ہو یا پانی کی لہر میں ٹپک سی مچھلی تیر جائے!۔

اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔

کار سب سے الگ تھلگ پارک کی گئی باوردی شوفر نے جلدی سے اتر کر

پچھلی نشست کا پٹ کھولا اور آفریں نے ایک مردانہ پیر کو سیاہ چمکیلے جوتے میں جگر باہر نکلے گیا۔

وہ پیچھے ہٹ گئی! جانے پہچانے لوگوں کے سامنے وہ خود کو عام سطح پر لانا پسند نہیں کرتی تھی!۔

سنگی ستون کے پیچھے سے اس نے مڑ کر دیکھا جہاں گ ایسے سفید لباس میں ملبوس کالی عینک لگائے وہ اسے بڑا خوبرو اور شاندار لگا!۔ وہ اس سے مرعوب ہونے لگی۔

اسے زیادہ پڑھے لکھے خاموش اور کم آمیز لوگ بہت پسند تھے۔ اور وہ ایسا ہی تھا۔ بہت کم اِدھر اُدھر دیکھا جاتا۔ شاید اس کا کوئی دوست بھی نہ تھا۔ اس نے آفریں کی یادداشت میں تو کبھی کسی جلسے یا تقریب میں حصہ نہیں لیا تھا!۔ اپنے کام سے کام رکھتا!۔

لیکن جب وہ کبھی چانسلر صاحب کے سامنے یونیورسٹی انٹرنس ہال عبور کرتا ہوا دیکھا جاتا تو اچھے اچھوں پر اس کا رعب بیٹھ جاتا!۔

آفریں نے سنا تھا کہ وہ ایک بڑے دولت مند باپ کا بیٹا تھا۔ ہاؤزنگ سوسائٹی میں اس کی شاندار کوٹھی تھی!۔

اور بہت سی باتیں آفریں نے سن رکھی تھیں!۔ لیکن وہ ان سے متاثر نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس کی علمیت قابلیت اور متانت سے متاثر تھی!۔ ہمیشہ خاموش رہنے والا اور بہت نرمی اور آہستگی سے گفتگو کرنے والا یہ طالب علم اسے بہت پسند تھا۔ لیکن اس کی پسندیدگی میں کسی اور جذبہ کی آمیزش قطعی نہ تھی۔ وہ اس سے عقیدت آمیز محبت کرتی تھی۔ جس میں اس کی علمیت کا احترام

شامل تھا۔ اس کی پسندیدگی کا جذبہ بے لوث تھا۔

جب وہ اپنے خیالات سے چونکی تو اسے پتہ چلا کہ ضرار وہاں سے جا چکا تھا!۔

خود بخود وہ شرما سی گئی۔ وہ اس کے بارے میں اتنا بہت سا کیوں سوچ رہی تھی!۔

پھر یہ خیال کر کے وہ تھوڑی سی افسردہ ہونے لگی کہ شاید ضرار اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچتا ہوگا۔ اسے پرواہ کیا ہوگی۔ عام سی ایک لڑکی کے متعلق سوچنے کو کچھ تھا بھی تو نہیں!۔

کلاسیں شروع ہوگئی تھیں وہ لیڈیز روم میں آئی اور میز پر رکھ کر اپنا فائل کھولا اور تبھی ویڈنگ کارڈ اس سے پھسل کر اس کی گود میں آگرا۔ اور پھر افسانے سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ موقعہ مناسب ہے اسے ضرار کو شادی کا کارڈ دے آنا چاہئے!۔ ورنہ وہ اپنی مصروفیات میں الجھ گیا یا پھر اسی کی کلاس شروع ہوگئی تو وقت نہ ملے گا۔

ضرار کا کمرہ نسبتاً ایک سنسان سی راہداری میں تھا۔ اسی سلسلے میں کئی اہم دفاتر بھی تھے۔ اس لئے اس طرف ہر وقت سناٹا چھایا رہتا۔ اگر کوئی چلتا پھرتا تھا تب بھی دبیز بانات کے قالین پر قدموں کی چاپ سنائی نہ دیتی!۔

ضرار کے کمرے میں خاموشی تھی۔ اور چوڑے دروازے پر پڑا ہوا آسمانی پردہ ہواؤں کے ہلکورے سے آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا!۔ وہ دروازے پر پہونچ کر ٹھٹھکی۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچے گا۔ میں نے تقریب بھر ملاقات پیدا کی ہے۔ وہ عام آدمیوں کی طرح معمولی قیاسات نہیں لگاتا! چھوٹی سی بات کو

بڑے اور معنی خیز طریق پر سوچتا تھا!۔

"ٹ۔ یہ میں نے کیا کیا۔ کیوں آئی یہاں تک۔

وہ واپسی کے لئے مڑ ہی رہی تھی کہ دفعتاً پردہ ہٹا اور شہزاد باہر

نکل آیا۔ آفریں کی پلکیں جھپک گئیں!۔

اوہ۔ آپ ہیں؟" شہزاد نے کہا۔ اس کی آواز نرم بھاری اور عجیب

سی دلکش تھی۔

آفریں چپ رہی!۔

آئیے۔ تشریف لائیے!" اس نے پھر کہا اور پیچھے ہٹ کے پردہ سرکا دیا

کمرے کی فضا روشن ہوادار اور پرسکون تھی۔ آفریں اندر جاتی ہوئی

جھجکی۔ لیکن اب واپس مڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے قدم بڑھا دئیے۔

پھر شہزاد بھی کمرے میں آگیا اور پردہ برابر کر دیا۔

بیٹھئیے!" وہ شاید مسکرایا تھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

وہ سحر زدہ سی کرسی پر ٹک گئی۔

شہزاد اس کے سامنے کرسی پر آبیٹھا اور کہنیاں میز پر ٹیک کر انگلیوں

میں انگلیاں الجھا لیں۔

دو لمحوں کی خاموشی کے بعد شہزاد نے گفتگو چھیڑی۔

"آپ شاید میگزین کے لئے کوئی کہانی لائی ہیں؟"

جی۔ جی نہیں!" اس نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پا لیا۔ کہانی تو میں

نے ابھی۔ پوری لکھی بھی نہیں ہے!"

تو پھر اسے جلدی سے لکھ ڈالئیے!" اس نے بے حد دلکش آواز میں

کہا: آپ ہی کی کہانی کے انتظار میں میں نے پورا میگزین روک رکھا ہے۔
آفریں نے سوچا۔ بالکل مغرور نہیں ہے۔ پتہ نہیں اسے کس نے کس حال میں دیکھا اور جھوٹے سچے افسانے بنا دیئے۔
م۔ میں تو۔ دراصل۔ آپ کے پاس اس لئے آئی تھی کہ ۔۔۔۔"
وہ رک گئی۔
کہئے آفریں! علی حمزہ نے مدھم لہجے میں کہا: بے تکلفی سے کہئے۔ آپ جھجک کیوں رہی ہیں۔ آپ کے لئے میں نیا تو نہیں!"
تب آفریں کو اپنی پوزیشن بڑی مضحکہ خیز لگی۔ وہ اس سے خائف کیوں تھی؟ ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی کے ساتھ کا ایک طالب علم ہی تو تھا۔ اس کا استاد نہیں تھا۔
اس نے اپنی ہمت کجرائی کی اور سر اٹھایا۔
"دراصل میں آپ کو یہ رقعہ دینے آئی تھی۔ آنے والے جمعہ کو میرے بھائی کی شادی ہے اور اس میں آپ کو ضرور شریک ہونا ہے!" اس نے خوشنما چمکیلا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور جب وہ سر جھکا کر کارڈ کی عبارت پڑھ رہا تھا تب آفریں نے بڑے قریب سے اسے دیکھا۔
مردانہ خوبروئی اور وجاہت کی مثال تھا وہ۔ خوبصورت ستواں ناک، اونچی پیشانی جس سے اس کی قابلیت اور ذہانت کا نور پیدا ہوتا! خوبصورت ہونٹ اور غلافی آنکھیں۔ گھنی گھنی سیاہ خمیدہ پلکیں، شہابی رنگت، اس کے بائیں رخسار پر لبوں کے گوشے کے قریب ایک سیاہ خال جیسے قدرت نے اپنے ہاتھ سے نظر کا ٹیکہ لگا دیا تھا!

ہنس پڑا۔ پل بھر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرے کی روشن اور ہوادار فضا بڑی ناپُرسکون ہو رہی تھی۔ بڑے دریچے سے دور دور بکھری ہوئی ہوسٹلوں کی زرد و سفید عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ دریچے کی سنگی چوکھٹ سے سرخ و سفید جنگلی پھولوں کے گچھے ٹکرا رہے اور لطیف سی مہک پھیلا رہے تھے۔ نیچے کمپاؤنڈ میں کہیں دور سواریوں کے گزرنے سے سرخ بجری کچلتی اور اس کی آواز خاموشی کا دبیز پردہ چاک کر دیتی۔ ان کے سروں پر پنکھا آہستہ آہستہ سرسرا رہا تھا۔

باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ آفریں چاہتی تھی کہ اٹھ کر چلی جائے۔ لیکن کوئی سی ان دیکھی زنجیریں تھیں جنھوں نے اسے جکڑ رکھا تھا! وہ اپنی نشست سے ہلی تک نہیں اور انتظار کرتی رہی کہ ضرار اور کیا کہتا ہے۔

وہ کاغذات پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو نچا رہا تھا اور شاید وہ بھی آفریں کے کچھ کہنے کا منتظر تھا!۔

پھر آفریں نے اپنے فائل سے ادھورا افسانہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر آپ کو اچھا لگے تو میں اسے آگے لکھوں گی۔ ورنہ نہیں!"

ضرار نے بڑے اشتیاق سے اوراق لے لئے اور سنجیدگی سے بولا "میں آپ کو کیا بتا سکوں گا۔ بس وقت گزاری کے لئے کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ آج تک میں نے لکھا کچھ بھی نہیں!"

"پھر بھی ———— !"

اس نے سرسری نظریں چار چھ سطروں پر دوڑائیں۔ اسی قدر کاوش تھی آفریں دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ بھلا اس طرح کیا اندازہ ہو سکے گا لیکن

شہزاد نے بے حد تعریف کی۔

"بڑی دل کش اٹھان ہے۔ پورا افسانہ نہایت متاثر کن ہوگا۔ میں اسے سب سے پہلے دوں گا۔ اور اس پر اپنی طرف سے ایک نوٹ بھی لکھ دوں گا۔ میرا مشورہ تو یہ ہے آفریں کہ آج آپ شام تک اسے مکمل کر کے مجھے دیدیجئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ آپ شادی کی مصروفیات میں گم ہو جائیں، اور میں بس انتظار ہی کرتا رہ جاؤں"

"آج شام تک؟" آفریں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں"

"لیکن اس وقت تک تو آپ چلے جائیں گے۔"

"اگر آپ وعدہ کیجئے کہ مجھے مایوس نہ کریں گی تو میں شام تک انتظار کرتا رہوں گا۔"

"لیکن، مجھے دیر ہو جائے گی تو امی کیا سوچیں گی؟" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"آپ شاید یہاں کبھی دیر تک رکی بھی نہیں؟"

"جی نہیں"

"میں اس چیز کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ شریف لڑکیوں کو بزرگوں کے مقررہ حدود میں زندگی گزارنا چاہئے۔ بیجا آزادی ایک خود فریبی ہے جس نے عورتوں اور لڑکیوں کو زیادہ پابند کر رکھا ہے۔ آزادی کے بہانے انھوں نے متعدد ذمہ داریوں کی آہنی بیڑیاں اپنے پیروں میں ڈال رکھی ہیں جن سے اب چھٹکارہ ممکن نہیں رہا ہے۔ میں عورتوں کو قدیم معاشرت

کا پابند ہی دیکھنا چاہتا ہوں!"

"آپ کے خیالات بھی بہت قدیم ہیں!" آفریں کے کان گرم ہونے لگے۔ خدا جانے وہ اسے کن نظروں سے دیکھتا ہے۔

"جی ہاں!" وہ جیسے خود سے محجوب ہو کر بولا۔ "اس روشن زمانے میں میرے خیالات بہت تاریک معلوم ہوتے ہیں، اسی لئے تو میں سب کے سامنے ان کا اظہار نہیں کرتا۔ اور اپنوں کے سامنے کہنے میں کیا حرج ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال؟" وہ کچھ چونکی۔ بڑی دیر ہو رہی تھی۔ پر اسے اٹھنا تھا۔ وہ کچھ الجھ کر بولی "جی ہاں۔ میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ لڑکیوں کو آزادی کی راہ پر اتنا آگے نہیں بڑھ جانا چاہئے جہاں بہت آگے انھیں کئی خطرناک موڑ کا سامنا کرنا پڑے۔"

"بس اسی موضوع پر ایک مضمون لکھ ڈالیے۔"

"موضوع بہت پرانا ہے!"

"آپ لکھیں گی، نیا لگے گا!"

وہ چپکے سے ہنسی اور اٹھنے لگی۔

"یہ آپ کا افسانہ" شہزاد نے ورق اس کی طرف بڑھا دئے۔

"تو پھر شام تک!" وہ بولی۔

"جی ہاں۔ اگر فرصت ہو تو۔ میں منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ!"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا سگریٹ کیس اور لائیٹر اٹھا کر دریچہ میں جا کھڑا ہوا۔ آفریں باہر نکلی تب بہت خوش تھی۔ اپنی روح مسرت کی وہ کیفیت جو جیسے

نہ کر سکی!۔ اسے شہزاد بہت اچھا لگتا تھا۔ ان لوگوں پر سخت غصہ آیا جو اسے مغرور آدم بیزار، غلط نفسیر، اور ظلم آمیز بتاتے تھے۔ اس نے اس سے کتنی اپنائیت سے باتیں کی تھیں۔ اس کے انداز میں غرور و تکبر کا شائبہ بھی نہ تھا۔ حالانکہ وہ کئی ایک اعلیٰ ڈگریاں رکھتا تھا۔ اور آفریں ابھی بی۔ اے کے آخری سال میں تھی۔ عمر و تجربہ میں اس سے کہیں کم۔ اگر وہ چاہتا تو اسے لمبی دوری ہی سے ٹرخا سکتا تھا!۔ لیکن ــــ وہ مسرور اور مگن سی کرسی پر بیٹھی قلم ہونٹوں میں دبائے آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ اسے انگلش کلاس میں جانا تھا۔ گھنٹی بج چکی تھی لیکن اس نے سوچا۔ آج کی خوشی پر ایک پیریڈ قربان کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی کہانی ایک بار پھر دہرائی۔

"ہیلو ڈارلنگ۔" لیڈیز روم میں شہلا داخل ہوئی۔

"ہیلو" اسے ناگوار گزرا۔ "ہیں ذرا، مطلب یہ کہ لکھ رہی ہوں۔ پلیز۔ میں کچھ بزی ہوں!"

"گو آن۔ ود یور بزنس" شہلا ہنسی۔ "ارے ہاں۔ تم مسٹر شہزاد کے کمرے میں کیا کرنے گئی تھیں۔ یو ہیلپ لیس گرل۔"

"کیوں؟" آفریں نے تلخ لہجہ میں پوچھا۔

"ارے بی بی۔ ابھی سویرا ہے" شہلا اس کے سامنے آ بیٹھی "خود پر رحم کرو۔ شاید تم نے ڈاکٹر اسحاق کی بیٹی مریم کا قصہ نہیں سنا!؟"

"کچھ اڑتی پڑتی کہانی ہما نے سنائی تھی۔ یہ کیا کہانی ہے؟"

"اُف۔ اللہ کی لڑکی بدھو۔ ابھی جب ہما جیسے پہلے کی تو بات ہے۔ تم جان بوجھ کر بھول رہی ہو۔ ارے وہ کہانی تو ایک المیہ داستان بن کر سب میں

پھیل گئی تھی"!

محبت کی داستان؟ شاید۔" آفریں نے برا سا منھ بنایا۔ افسانہ نگار اپنے دل میں سب ہی کے لئے نرم جذبات رکھتے ہیں۔ لیکن تم ہنہ بنا رہی ہو! افسوس۔ پر مجھے یقین ہے کہ تم مریم کا قصہ سن کر ضرور متاثر ہو جاؤ گی۔

"دیکھو بھئی۔ یہ علمی درسگاہ ہے۔ یہاں سب کو صرف ایک پاکیزہ مقصد تحصیل علم کا لے کر آنا چاہیئے۔ اب اگر کوئی مخلوط تعلیم کی برکتوں سے فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ کا روگ جان کو لگانے تو ظاہر ہے کہ اس پر صرف منہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہمدردی کسی طرح نہیں ہو سکتی"!

بے چاری مریم بھی اسی طرح اونچی اونچی باتیں کرتی تھی۔ مگر جب اونٹ پہاڑ تلے آیا۔ تب۔ سچ آفریں۔ ایک دفعہ دیکھا تھا اس مغرور وحشی ضرار کو اور بے چاری اس کی محبت میں ہوش و خرد کھو بیٹھی۔ عجیب عالم ہو گیا تھا۔ اپنی نسائیت، اپنا غرور، اپنی پوزیشن سب کچھ بھول گئی۔ ان راہوں پر کھڑی رہتی تھی جہاں اسے امید بندھتی تھی کہ شاید ضرار گزرے گا۔ وہ نظر آجاتا تھا تو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کرتی! آہ۔ بے چاری۔ اسے سب نے سمجھایا۔ احساس دلایا۔ وہ بہت برا کر رہی تھی۔ لیکن محبت جیسی بلائے بد نصیحتوں کو خاطر میں کب لاتی ہے۔ اس نے کچھ نہیں سنا۔ دل کے ہاتھوں اتنی مجبور ہوئی کہ اسے خط لکھے۔ نجانے خطوں میں کیا کیا لکھا۔ اور تم سنو آفریں کہ ایک مجبور و درماندہ لڑکی کے جگر کے خون سے لکھے ہوئے محبت نامے اس ظالم بیدرد نے چانسلر صاحب کو دکھائے۔ انھوں نے مریم کو اپنے اجلاس پر بلایا اور اس

سے کہا تھا کہ وہ اپنا اور اپنے نیک نام باپ ڈاکٹر اسحٰق کا نام ڈبونے کی حرکتیں کر رہی ہے۔ تو پھر۔

تو پھر؟۔ سانس روک کر آفریں نے پوچھا۔

بس کہانی ختم ہو گئی آفریں "! شہلا نے ٹھنڈی سانس لے کر اور گلوگیر لہجے میں کہا: مریم کو ایسی امید نہ تھی۔ اتنی بھی بے دردی۔ اس کی محبت سے ایسا تمسخر۔ وہ جان پر سے ٹوٹ تو گئی تھی۔ اس نے باپ کی ڈسپنسری سے کوئی زہریلی چیز نکال کر کھالی۔ اور۔

مر گئی؟" آفریں نے سکتے کے عالم میں پوچھا۔

اور پھر کیا کرتی۔ اپنی بے لوث محبت کی توہین کہاں تک برداشت کرتی؟

تو کیا ایک دفعہ بھی ضرار صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی "؟

آفریں نے بڑے تعجب اور تاسف سے پوچھا۔

بالکل نہیں۔ وہ تو اس کے سائے سے بھی بھاگتے تھے "!

میں نے سنا ہے کہ مریم بہت حسین تھی۔ تو پھر۔ کیا ضرار صاحب اس کے حسن سے بھی متاثر نہیں ہوئے؟۔

میں نے کہا نا پتھر ہے پتھر "شہلا نے تلخ لہجہ میں کہا" تم ان کے گُن گا رہی ہو۔ بہت مغرور خود پرست آدمی ہیں۔ خدا نہ کرے ایسا ہو کہ آخر میں تمہیں بھی کوئی دھکا لگے "!

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے شہلا!" آفریں نے جز بز ہو کر کہا: میں ان احمقانہ محسوسات سے بڑی دور ہوں۔ ان سے میرا واسطہ صرف قلمی معروفیات کی بنا پر ہے۔ اور پھر یہ تم جو زبردستی ضرار صاحب کو ظالم اور سنگدل بنا رہی

ہو تو یہ بھی مجھے یک طرفہ بات لگ رہی ہے۔ اب اگر میں تم سے محبت شروع کر دوں اور تم مجھ سے کچھ التفات نہ کرو تو یہ میری زبردستی ہی ہوگی نا کہ میں تمہیں مطعون و معتوب کرنے کے لئے خودکشی کر گزروں۔ محبت دل کا کھیل ہے شہلا۔ زبردستی کا سودا، تجارت نہیں!!"

پہلے سب ایسے ہی دعوے کرتے ہیں" شہلا ہنس کر اٹھ گئی "خیر تم لکھو۔ میں تمہیں مزید ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ پر ڈیپ ٹریڈر۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال برابر کرتی اٹھ کر راہداری میں نکل گئی۔

اور آفریں دس منٹ تک بالکل خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اس قسم کی کہانیاں اسے بڑا ڈس موڈ کرتی تھیں!۔ اسے مریم یاد آئی۔ بڑی اسمارٹ چنچل اور ترقی پسند سی لڑکی تھی! پتہ نہیں اس نے کس طرح موت کو گلے لگایا ہوگا۔ جب اس سے زندگی کی آخری رمق بھی رخصت ہو رہی ہوگی تب کیا اس نے اپنے محبوب کو یاد کیا ہوگا؟

آفریں کچھ لکھ نہ سکی، اور ایک پیریڈ بھی اٹینڈ نہ کر سکی۔ اس کا دن یونہی بے کار گزر گیا۔ آہستہ آہستہ دوپہر ڈھل گئی اور یونیورسٹی خالی ہونے لگی!۔

لڑکیوں اور ان کی نگراں کا مسز شرما سے لیڈیز روم بھی خالی ہو گیا۔ اس پر بے تحاشہ گھبراہٹ سوار تھی!۔

یہ اس نے کیا کیا؟ کیوں اتنی مسحور ہو گئی تھی۔ ایک غیر آدمی کی شخصیت سے اس سے کوئی انکار ہی نہ ہو سکا!۔

جلدی جلدی وہ کتابیں سمیٹ کر بھاگنے والی تھی کہ چپراسی ہاف ڈور

کھول کر اندر آیا۔ اسما نے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے سنبھال رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں بٹر دان تھا۔

"صاحب نے آپ کے لئے یہ سب کچھ بھجوایا ہے۔ آپ نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا۔" اس نے اسے اتنا موقعہ بھی نہیں دیا کہ وہ میز سجاتا۔ بڑی اکھڑ دری بن گئی۔

"صاحب کا بہت بہت شکریہ۔ میں جا رہی ہوں!"

اس کار کشا نیچے موجود تھا۔ نور میاں اس میں نیم دراز بیڑی پی رہے تھے۔ آفریں نے کتابیں سینہ سے چپکائیں اور کاریڈور سے نکل کر نیچے چلی گئی اب وہ مزار کے پاس اتنی دیر تک بیٹھے رہنے اور اس سے فضول سی باتیں کرنے پر دل ہی دل میں بہت پچھتا رہی تھی!۔

کون جانے کب شہلا کی پیش گوئی پوری ہو جائے۔

بالآخر اوصاف صاحب کے گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ آفریں اور برکہ بہت خوش تھیں۔ انھیں وہ لڑکی بھابی کے روپ میں ملنے والی تھی۔ جسے انہی دونوں نے پسند کیا تھا۔ اور تب آفریں بہت قیمتی لباس میں ملبوس اپنے کمرے سے نکلی۔ بارات کی روانگی میں دیر نہ تھی۔

برکہ اور آفریں ایک دوسرے کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنس پڑیں۔

اس بھاری ساڑی میں تو بس بزرگ خاتون کی جگہ ایک پاندان سنبھال

کے بیٹھ جانا پڑے گا۔ مجھے تو ابھی سے الجھن ہونے لگی ہے "؛ برکہ بولی۔

ارے میں تو سوچتی ہوں اس اناڑی سیلز بوائے نے کچھ گھپلا ضرور کیا ہے۔ امی کا خیال تھا کہ ان ساڑیوں میں چاندی ہی چاندی ہے۔ یہ ہمیں بہت سستی مل گئیں"! آفریں بولی "؛ کہیں ہم نے اسے پاگل بنا کے کوئی نادانستہ بے ایمانی تو نہیں کی؟"

اپنا فلسفہ رہنے دو" برکہ بولی "؛ ایسی عمدہ ساڑیاں پوری مہمان بیبیوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی نہ ہوں گی!۔

برکہ؟۔ کیا تمھاری امی نہیں آ رہی ہیں؟" چور لہجے میں آفریں نے پوچھا۔

کیا پتہ "؛ برکہ کچھ اداس ہو گئی۔ اگر دادی اماں زبردستی لے آئیں تو آئیں گی۔ مگر ایک دفعہ امی نے کہا تھا کہ وہ ڈیڈی کا سامنا کرنا پسند نہیں کرتیں "؛

چچا جان کی یہ سنگدلی مجھے پسند نہیں برکہ؟۔

مجھے کب پسند ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے نصیب والدی، ماں کے پاس جا گے ورنہ ڈیڈی تو اپنی سنجیدگی اور ظلم سے مجھے مار ہی ڈالتے "؛

میرا جی چاہتا ہے کہ میں چچی جان کو خود جا کے لے آؤں۔ اب بھلا چچا جان اندر زنانے میں کیوں چلے آئیں گے!۔

نہیں آفریں نہیں! اس مسئلہ پر بڑوں ہی کو سوچنے دو۔ تم نے دیکھا نہیں اس روز کھانے پر کیا جھگڑا ہو گیا تھا!۔

دادی اماں کہتیں تو ہیں شاید!۔

کہہ تو رہی تھیں۔ پھر پتہ نہیں، گئیں کہ نہیں گئیں!۔

اللہ کرے چچی جان چلی آئیں!، آفریں بولی۔

اور یہاں آنے کے بعد چھوٹی ممی سے ان کی مڈبھیڑ ہو جائے تو پھر ڈیڈی برا مانیں گے۔" برکہ نے کہا۔ پھر وہ عجیب سی کھسیانی ہنسی ہنس دی۔ "آفریں میں شرم کے مارے زمین میں دھنس جاتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میری دو مائیں اور دو باپ ہیں۔ توبہ توبہ۔ میری امی ہی کو کیا سوجھی تھی۔ وہ میرے ہمارے ڈیڈی کا ساتھ نہ دے سکتی تھیں۔ انھوں نے میجر صاحب سے نکاح کیوں کر لیا؟"

"اچھا اب تم امی کی کوئی غلطی مت پکڑو۔ گھبراہٹ میں اچھے اچھے عقلمند کچھ نہیں سوچتا۔" آفریں نے کہا۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ برکہ اپنی ماں کی منتظر تھی۔ رہ رہ کر وہ سر اٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ شاید دادی اماں اس کی امی کو لے کے آجائیں۔ لیکن اس کے دلکش معصوم چہرے پر اس وقت دکھ کے بادل چھا گئے جب دادی اماں اداس اداس مغموم سی نظر آئیں۔

"کیا ہوا۔ اماں بی؟" امی نے پوچھا۔

"پھوٹ گئے نصیب" دادی اماں نے جواب دیا۔ "خود بھی آنے کو تیار تھی اور اس کے میاں نے بھی اجازت دے دی تھی۔ ارے میں کہتی ہوں کہ میں اپنے لڑکے کو انتخاب میاں پر سے صدقہ کر دوں۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر انھوں نے مجھے سلام کیا پھر میرے پیروں کی طرف جھکے اور ــــ"

"مگر باجرہ آکیوں نہ سکیں اماں بی؟" امی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بخار چڑھا تھا غریب کو۔ بمشکل آنکھ کھول کے مجھے دیکھا تھا" دادی اماں نے کہا۔ "انتخاب میاں کہہ رہے تھے کہ چار روز سے یہی حال ہے۔ کسی بڑے ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔ اللہ اسے جلدی اچھا کر دے۔ رو رو کے دیتی تھی بے چاری۔ مجھے یہاں شادی میں شامل نہ ہونا ہوتا تو میں وہیں رہ جاتی۔ انتخاب میاں

کو بھی تسلی ہوتی، تھوڑی کا جی بھی ٹھہر جاتا!"

"بہت بخار تھا اماں بی؟" امی بولیں۔

"تھا تو بہت تیز" پھر دادی اماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری سے کہا۔ "چار مہینے کا حمل تھا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ اسی مارے ـــــــ!"

"اچھا اچھا" امی نے کہا۔ "نکاح کے بعد میں دلھن کے گھر سے اُدھر جاؤں گی۔ اماں بی آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ اگر آپ کا دل چاہے تو وہیں رہ جایئے گا۔"

"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی دلھن۔ اچھا تو چلو پھر!" دادی اماں خوش ہو کر بولیں۔

"میرا تو اب جی ہی نہیں لگ رہا!" امی نے کہا اور پریشان سی ایک طرف چلی گئیں۔

"ہم بھی دونوں چلیں گے" آفریں نے برکہ سے کہا جو بالکل خاموش سی بیٹھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی خوشیاں بھی ملیامیٹ ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اور آفریں کے ساتھ دلھن کے گھر چلی گئی۔

شادی خانے میں نکاح کے بعد بڑی پُر مسرت گڑبڑ مچی۔ آفریں اپنی نئی نویلی بھابی کے پاس بیٹھی اس کی طلائی چوڑیاں گھما رہی تھی! اور اس کے زرتار گھونگھٹ میں منہ ڈالے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

"جی۔ بھائی جان نے آپ کی ہجر کن میں پورے ہفتے مجھ سے کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا! اب وہ اتنے لاغر ہو گئے ہیں کہ آپ کو شاید خوردبین سے نظر آئیں گے!"

ایک گھنٹے کی بیاہی دلھن نے جل کر آفریں کی بانہہ میں چٹکی لی اور

برکہ ہنس دی: وہ ادھر کی جھجھریاں۔ مگر تم خواہ مخواہ کیوں جھانکو گی تمہارے لئے تو روز کے جلوے ہیں۔

کتنی واہیات باتیں کرتی ہو۔

غضب کا شاندار آدمی ہے آفریں!۔

ہے تو۔ اچھا جگہ۔ ہمیں کسی سے کیا لینا دینا ہے"

آفریں نے کہہ تو دیا لیکن وہ ضرار کو جھانک کر دیکھنے کی آرزو پر قابو نہ پا سکی۔ برکہ اسے جھلملیوں کے قریب لے گئی اور آفریں نے ایک جھلمل سے آنکھ لگا دی۔

اسے ضرار ہمیشہ سے زیادہ خوبرو اور وجیہہ نظر آیا۔ اس نے گرم سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور عام مہمانوں سے کسی قدر الگ تھلگ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا! اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ خاموش اور باوقار سا۔ وہ سب سے نمایاں لگ رہا تھا!۔

پھر ان کے پاس آفریں کے بھائی توصیف احمد آ بیٹھے۔ انھوں نے اپنا سہرا اور ہار پھول اتار کر کہیں رکھ دیئے تھے اور بڑی بے تکلفی سے ضرار کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پرانے دوست ہوں۔

رات کے بارہ بجے توصیف احمد اپنی دلھن بیاہ لائے۔ اور دادی اماں برکہ اور آفریں کے ساتھ باہر نکلیں!۔

آفریں نے دیکھا کہ گیٹ سے ہٹ کر ضرار اپنی گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا تیز روشنیوں کے ہجوم میں اچانک اس کی نظریں آفریں پر پڑیں۔ اور وہ اپنی

آپ فرمائیے۔" اس نے بے حد ادب سے آفریں سے پوچھا۔

ارے کیا کھڑے کھڑے رات گزارنا ہے کیا؟" دادی اماں گھبرائی آواز میں بولیں: ادھر نجانے دلھن کا جی کیسا ہے۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی جانبہار میں اس سے وعدہ کر آئی تھی کہ بارات کے نکلنے کے بعد ہی میں بھی نکلوں گی"۔ پھر وہ حزار سے بولیں: "میاں تم کو خدا سلامت رکھے۔ ایک رکشا لے دو۔ نگوڑا کون سا محلہ بیٹی ؟" وہ برکہ سے مخاطب ہو گئیں۔

جوبلی ہلز" برکہ چپکے سے بولی۔

میاں اس کی ماں بیمار ہے اسے دیکھنے جانا ہے"۔ دادی اماں جو بہت زیادہ گھبرائی ہوئی اور رحواس نظر آ رہی تھیں، حزار سے بولیں۔

تو پھر آئیے بیگم صاحبہ:" اس نے بڑی شائستگی سے کہا: میں اپنی گاڑی میں آپ کو پہنچا کر دیتا ہوں؛"

تمھاری گاڑی ——— !" دادی اماں نے کہا۔

جی۔ وہ کھڑی ہے سامنے۔"

میاں مگر تمھیں کیا تکلیف دوں۔۔۔ تم اپنے گھر جا رہے ہو گے!"

کوئی بات نہیں۔ تشریف لائیے۔"

حزار نے گاڑی کے نزدیک پہنچ کر ایک بے حد قابل فہم حرکت کی۔ اس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور براہ راست برکہ اور آفریں سے بولا: آپ دونوں اندر تشریف رکھیے"۔ اور پھر وہ دادی اماں کے سامنے جھک گیا۔ "بیگم صاحبہ آپ اگر سامنے میرے پاس ۔۔۔"

عجیب حرکت تھی۔ لیکن آفریں کی اس کی یہ احتیاط بے حد پسند آئی۔

اگر اسکے بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو دونوں ہی کو اپنے قرب میں آباد کرتا۔
بھلا ستر سال کی بڑی بی پانسا بٹھانے کی چیز تھیں؟!۔

دادی اماں نے بھی کمال ہی کر دیا۔ وہ مزے میں آگے تو بیٹھ ہی چکی تھیں
مگر خاموش نہیں بیٹھیں۔ کارچلتی رہی اور وہ شہزاد کو اپنے خانگی حالات سے
آگاہ فرماتی رہیں۔ انھوں نے الطاف صاحب کی ناخلفی کا تذکرہ کیا۔ ان کی
بیوی کی بے چارگی کا رونا رویا۔ اور یہ بھی کہا کہ کتنے ارمانوں سے وہ چھوٹی دلھن
کو بیاہ کر لائی تھیں مگر ناخلف اور ناشدنی الطاف نے کیسا ان کے دل پر
داغ لگا دیا تھا۔

شہزاد مسکراتا اور جی ہاں جی نہیں اچھا اچھا کرتا رہا۔

دونوں لڑکیاں دل ہی دل میں سخت خفا تھیں۔ دادی اماں تو خواہ مخواہ
کی باتیں کرنے کی عادی تھیں۔ مگر شہزاد ان کا کون تھا وہ اس سے کیوں
اپنے حالات کہہ رہی تھیں!۔

جونہی ہلز کا ایریا شروع ہوا تو شہزاد نے پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر ان کا
پتہ پوچھا۔ برکہ نے پتہ بتایا۔ تب آفریں نے سوچا کہ یونیورسٹی میں اس کے
بارے میں جو مشہور ہے کہ شہزاد کو صنف نازک سے نفرت ہے۔ وہ عورتوں
کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتا۔ تو یہ سب سچ ہی ہے۔

دادی اماں نے گھر پر اتر کر شہزاد کو بہت سی دعائیں دیں۔ وہ انکی خاطر
اپنی نشست سے اترا تھا۔ لیکن اس نے نہ تو پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔
اور نہ ان سے مخاطب ہوا۔ وہ خود ہی اتری تھیں۔

اب میں چلتا ہوں۔ بیگم صاحبہ۔ خدا حافظ۔۔۔ وہ بے حد ادب سے

ان کے سامنے جھکا۔ اور پھر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

"کیسا سعادت مند کتنا اچھا لڑکا ہے۔" دادی اماں کہہ رہی تھیں۔ لیکن آفریں کو حیرت تھی۔ اب تک اس نے اس کی شائستگی، تہذیب اور خوش اخلاقی کے متعلق جو بلند خیالات قائم کیے تھے۔ وہ سب درہم برہم ہو گئے۔ وہ کچھ مغموم تھی جیسے اسے ہزار کے سے انسان سے اس مخاصمانہ سلوک کی توقع نہ تھی!۔

میجر صاحب دادی اماں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور انہیں ہاتھوں ہاتھ برکہ کی امی کے پاس پہونچا دیا۔

بے چاری اب کچھ ٹھیک تھیں۔ دادی اماں کا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور پھر ضبط نہ کر سکیں!۔

دیکھئے۔ یہ اسی طرح بخار بڑھا تی ہیں!" میجر صاحب نے دادی اماں سے کہا۔ "چونکہ توصیف میاں کی شادی میں شریک نہ ہو سکیں۔ بس۔ اسی لیے صبح سے روتے روتے یہ حال کر لیا ہے!"

ہاجرہ بیگم نے آنسو پونچھ کر برکہ کو دیکھا جو چپ سی بنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دادی اماں سے باتیں کرنے لگیں۔

بیٹی تم کھانے کی میز دیکھ لو۔" میجر صاحب نے آفریں سے کہا۔ "میں تم سب کا انتظار کر رہا تھا!۔ اب بھوک برداشت سے باہر ہو رہی ہے۔"

آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا انکل؟" آفریں بولی۔

بس اب تم سب کے ساتھ کھاؤں گا۔

چچا جان نے کیا کھایا؟" آفریں نے پوچھا۔

نہیں امی۔ کبھی نہیں کہا۔

تھوڑی ہی مدت کے لئے آؤ بیٹی! میں بیمار ہوں۔ میجر صاحب اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔ اظہار بے چارہ اپنی جنہ بھر میری خدمت کرتا ہے۔ لیکن وہ بھی تو پڑھنے جاتا ہے۔ اکیلے میں مجھے وحشت ہوتی ہے۔ خدانہ کرے کبھی ایسا ہو جائے کہ میری طبیعت زیادہ خراب ہو جائے تو منہ میں دو بوند پانی ٹپکانے والا بھی نہ ملے!۔

ایسا مت سوچئے امی۔ بخار معمولی سی چیز ہے۔ چلا جائے گا۔ امی آپ بے حد کمزور دل، زود رنج اور بہت جلد رو دینے والی ہیں۔ آپ کبھی کچھ مت سوچا کیجئے۔ انکل اتنے اچھے آدمی ہیں۔ وہ آپ کا اتنا خیال رکھتے ہیں پھر آپ ادھر ادھر کی باتیں سوچ کر خود کو بیمار کیوں کر لیتی ہیں!

برکھا؟۔

جی امی۔

تو ادھر اچھی طرح تو رہتی ہے نا بیٹی؟

بالکل امی۔ میری فکر آپ مت کیا کیجئے"

میجر صاحب دروازے میں نظر آئے۔

"چلو بیٹی۔ کچھ کھا لو!۔

اب ۔۔ بات۔ کے ایک بجے انکل؟" برکھا بولی۔

کیا کیا جائے" وہ شوخی سے بولے "تمہاری امی نے نہ خود کھایا نہ مجھے کھانے دیا۔"

ناشتہ نرالے کھانا [illegible]

میز پر میجر صاحب کا بڑا بیٹا اظہار بھی تھا۔ برکہ کسی نفسیاتی کومپلکس کے تحت اس سے کھنچی کھنچی تھی۔ حالانکہ وہ بے حد شریف اور مہذب لڑکا تھا۔ اس نے خود کو بولڈ ہوتے اس سے پوچھا۔

"کون کون کی کتاب لائے آپ؟"

اظہار زیر لب مسکرایا: "ان کپڑوں میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔ بالکل ایک دلھن!"

کالج کے جراثیم آپ میں حلول کر گئے ہیں" برکہ بھی چپکے سے بھن بھنائی۔

"افسوس تم رونہ کر سکتا ہوں!"

"آپ اپنے ہوش میں رہیئے اظہار بھائی!"

میں کیا ہوش میں رہوں۔ ڈیڈی کو خود بھی ایک دلہن کی تلاش ہے!"

انکل!" برکہ آپے سے باہر ہو کر چیخی۔ میجر صاحب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سوری ڈیڈی" اظہار بولا: میں نے ان کا پاؤں کچل دیا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ محترمہ برکہ۔ درحقیقت یہ حماقت کے جراثیم، جو کالج سے آئے ہیں!"

تم ادھر آکے بیٹھ جاؤ بیٹی" میجر صاحب نے کہا۔ برکہ جلی بھنی سی میجر صاحب کے پاس جا بیٹھی۔

رات کے ڈھائی بجے تھے جب وہ سب اپنے اپنے بستروں پر پہونچے، آفریں تھوڑی دیر تکیہ پر سر دھرے آج دن بھر کی باتیں سوچتی رہی۔ پھر اسے نزار کا محتاط سلوک یاد آیا۔ پتہ نہیں اب اس کا سامنا کرتے ہوئے اسے کتنی شرم آئے گی۔

اس نے نہ صرف اس کی پرخلوص محبت ٹھکرائی تھی بلکہ اسے بے منتظر بھی

"شرم نہیں آتی آپ کو۔ رشتے میں آپ میرے بھائی لگتے ہیں۔" برکہ بڑبڑا رہی تھی۔ آفرین بی دیکھ رہی تھی آگے تو افسانہ بنا دے گی۔ اظہار ہی کی بیباکی اسے اپنی ماں کے پاس رہنے سے باز رکھتی تھی۔

جواب میں وہ مسکرایا۔ "رشتے کے بھائی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اور تیری آپ تو تم نے میرے تو اس عمر ہی پر بجلی گرا دی ہے۔"

"اظہار بھائی! خدا قسم شور مچا دوں گی۔ آپ مجھ سے اکیلے میں باتیں کرنے کے موقعے ڈھونڈتے ہیں۔ میں اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ آپ بالکل بدتمیز ہوتے جا رہے ہیں!"

"بالکل!" وہ دیر سے ہنسا۔

"ہاں!" اس کا منہ پھول گیا۔

"خیر۔ آئندہ محتاط رہوں گا۔" اس نے کہا اور پیچھے سے ہاتھ آگے بڑھایا پھر سنجیدگی سے بولا: "یہ لو۔ اپنی کتاب۔ واپس کرنے میں جلدی نہ کرنا۔ کم از کم مجھے یہ تو اطمینان رہے کہ میری کوئی چیز تمہارے پاس ہے!"

"زحمت ہوئی صاحب۔ براہ کرم اپنا راستہ ناپیے!"

"صبح کو ملے بغیر مت چلی جانا۔ ورنہ تمہارے گھر آ دھمکوں گا!"

"آپ امی کی بہت خدمت کرتے ہیں۔ امی آپ کی تعریف کر رہی تھیں آپ کا بہت بہت ——"

"بے کار۔ کیا وہ میری ماں نہیں ہیں۔ اچھا شب بخیر!"

وہ مڑ کر چلا گیا اور اپنی دلنواز شخصیت کا تاثر چھوڑ گیا۔

برکہ اچھی بیٹی کے لئے بھاگ تھی اور اظہار کی معنی خیز گفتگو سے نا آشنا

نہ تھی! وہ اسے پسند بھی تھا۔ زندہ دل بذلہ سنج، مصیبتوں میں گھبراتا نہیں تھا۔
جب میجر صاحب سے اس کی امی نے نکاح کیا تھا تب وہ چودہ پندرہ برس
کا خاصہ سمجھدار لڑکا تھا۔ اس کی ماں کا انتقال بچپن میں ہو چکا تھا۔ اس نے
اپنی دوسری ماں کا استقبال خندہ پیشانی سے کیا۔ ہاجرہ نے خود بھی اس کے
ساتھ سوتیلا پن اختیار نہ کیا تھا۔ ان کا یہ نامناسب قدم محض شوہر سے
انتقام لینے پر مبنی تھا۔ بعد کو غصے اور انتقام کے بھوت سر سے اترے تو وہ اپنی
حرکت پر پچھتانے لگیں۔ ویسے میجر افتخار حسن اور اظہار دونوں ہی بہت
شریف اور وسیع الخیال نکلے۔ میجر صاحب نے کبھی انھیں طلاق یافتہ ہونے
کا طعنہ نہ دیا۔ وہ انھیں چاہتے اور ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اظہار
انھیں امی کہہ کر مخاطب کرتا اور ان سے بہت محبت کرتا تھا۔

لیکن نجانے کیا بات تھی، ہاجرہ کبھی اپنے پہلے شوہر کی یاد و محبت کو
اپنے دل سے نہ نکال سکیں۔ حالانکہ انھوں نے انھیں ستایا اور دوسری
عورت کا دکھ دیا تھا۔ طلاق کا کلنک ان کی پیشانی پر لگایا تھا۔ ان کی گود سے
بچی چھین لی تھی۔ تکلیف دینے اور دکھ پہنچانے کی کوئی حد الطاف صاحب
نے باقی نہیں رکھی تھی! لیکن پھر بھی ہاجرہ الطاف کی محبت اپنے دل سے کھرچ
کے نہ پھینک سکیں اور کبھی دوسرے شوہر کے گھر میں خود کو فٹ نہ کر سکیں۔
لیکن انھیں مسرور رہنے کی اداکاری تو کرنی ہی تھی! دوسرے شوہر کی تہمت۔
سوتیلے لڑکے کی ماں ہونے کی لعنت۔ اور اپنی بیٹی کی جدائی۔ غرضیکہ ہاجرہ
بیگم نے خود پر بہت سے دکھ لاد رکھے تھے۔ دس سال سے مسلسل ان کی صحت
گرتی چلی آ رہی تھی۔ اور بے چارے میجر صاحب علاج کرا کرا کے تھکے

جا رہے تھے!۔

صبح سویرے اوصاف صاحب ان کی بیوی زینب اور توصیف احمد ہاجرہ بیگم سے ملنے آئے۔

توصیف تو بیٹے کی طرح ہی تھا۔ وہ جب سلام کر کے اپنی آپی جان کے سینے سے لگ گئے تو انہیں بے حد تقویت ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا دنیا میں وہ اکیلی نہیں!

"آج ڈنر پر آپ کو ضرور چلنا ہے آپی جان!" توصیف نے کہا۔

"اور مجھے؟" اظہار نے تعجب سے لقمہ دیا۔

"تم کون سے پھنّے خاں ہو جو تمہیں الگ سے رقعہ دیا جائے تمہیں تو میں کان پکڑ کے لے جاؤں گا!" توصیف نے کہا۔

"انشاء اللہ شام تک ان کی طبیعت کچھ سنبھل جاتی ہے تو ہم ضرور آئیں گے۔" میجر صاحب بولے۔ پھر دوسری باتیں ہونے لگیں۔

دادی اماں اور دونوں بچیوں نے کچن سنبھال لیا تھا میجر صاحب، توصیف اور اوصاف صاحب کے ساتھ باہر جا بیٹھے۔ اظہار بازار چلا گیا۔

"یہ ہوا کیا ہے ہاجرہ؟" فرزانہ کی امی زینب خاتون نے ہاجرہ بیگم سے پوچھا [illegible]

[illegible]

طبیعت بہت بگڑ گئی تھی۔ بخار بہت تیز تھا۔"

"گر پڑی تھیں کہیں؟"

"نہیں بھابی!" انھوں نے کہا تھا کہ غسل خانہ میں پانی رکھ دو۔ ہمیشہ ہی بے چارہ اظہار رکھ دیا کرتا ہے۔ اب کی مجھ پر شامت سوار تھی۔ بھری بالٹی اٹھالی تھی۔ بس۔ حالانکہ اظہار کہہ گیا تھا کہ بازار سے واپس آکر رکھ دے گا۔" یہ "جی" منع کرتے رہے۔ مگر مجھے تو یہ دن بھوگنا تھے۔"

"چلو بس۔ اب اس جوکھم کو ختم ہی کردو۔ اللہ رکھے اظہار اور برکہ تمھارے لئے بس ہیں۔"

ہاجرہ بیگم نے ایک طویل سانس لی اور خاموش ہو رہیں۔

"شام کو مت آنا!" زینب خاتون نے کہا۔ "پھر خدانخواستہ چکنائی وغیرہ کھانے سے کچھ خرابی پیدا ہو جائے!"

"زیبا بھابی۔ دلہن ذرا کچی ہے۔"

"ہاں۔ ماشاء اللہ۔ آج ولیمہ ہو لے تو کل میں اسے لے کر آؤں گی۔"

"بھابی آپ سب لوگ آگئے ہیں تو جی ٹھہر گیا ہے۔ ورنہ تنہائی مجھے کھائے لیتی تھی۔"

"تم بے کار باتیں سوچتی بھی بہت ہو۔ ہاجرہ!"

"تنہائی میں خواہ مخواہ ادھر ادھر کے خیالات دماغ میں گھس آتے ہیں۔" وہ دلہن!" بھابی بس تم سے کہتی ہوں کہ دس گیارہ سال ہو گئے یہاں رہتے ہوئے مگر ابھی تک مجھے اس جگہ سے اُنسیت نہیں ہوتی۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے مجھے جانا ہے!"

کتنے ترے دنوں ہمارے پاس رہ آؤ۔ افتخار بھائی کو بھلا کیا اعتراض ہوگا۔

وہ تو کچھ نہیں کہتے۔ مجھ پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے مگر آپ کے یہاں وقت بے وقت برکہ کے ڈیڈی جو آجاتے ہیں۔

تو کیا۔ تم مت نکلنا ان کے سامنے۔

چچی بی۔ ناشتہ تیار ہے۔ برکہ دروازے سے جھانک کر بولی۔ جائیے بھابی آپ ناشتہ کیجیے۔

آفریں نے اپنی چچی کو ہلکا پھلکا ناشتہ کرایا۔ انھیں اسپنج کرا کے صاف لباس پہنایا۔ اب ان کی طبیعت نسبتاً ٹھیک تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دالان میں آبیٹھیں۔

شام کو اوساف صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ کچھ دیر ٹھہر کر یہ لوگ واپس آگئے۔ برکہ کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماں کو چھوڑ کر جائے۔ لیکن اس نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

یونیورسٹی میقاتی تعطیلات کے سلسلے میں تین ہفتوں کے لئے بند ہو رہی تھی۔ توصیف انور اپنی دلہن عرشیہ سمیت چند دنوں کے لئے میسور بنگلور اور اوٹی کی تفریح کی غرض سے جا رہے تھے۔

میں بھی چلوں گی۔ آفریں نے کہا۔ اجنبی مقام پر بھابی بالکل اکیلی ہوں گی

اس کے علاوہ انھیں سیر سپاٹوں سے کبھی فرصت نہ ملے گی۔ ہیں کم سے کم انھیں پکا پکایا کھانا تو فراہم کر سکوں گی!"

"ہاں ٹھیک ہے۔" توصیف نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہم لوگوں کی خدمت کے لئے کم سے کم دو عدد خادمائیں نمزد ہونی چاہئیں۔ اچھا ہوا تم نے اپنا نام پیش کر دیا۔ اب ہمارڈ و بھاردو کے لئے برکہ بھی کچھ ایسی بری نہیں!"

برکہ برا ماننے کے بجائے اچھل پڑی۔ "میں آپ لوگوں کے کپڑے بھی دھو دوں گی۔ مجھے ساتھ لے چلئے۔ اللہ بھائی جان۔"

"تنخواہ ابھی سے طے کر لیجئے۔" شوخی سے رشیہ نے لقمہ دیا۔ "ایسا نہ ہو کہ کہیں بعد کو یہ اوپر کا کام کرنے والیاں جھگڑا کریں!"

"تنخواہ ونخواہ کیا۔" توصیف نے قہقہہ لگایا۔ "ہمارا بچا کھچا کھا لیں گی اور ہمارے کپڑوں کی دھلائی سے جو جھاگ بچے گا اس میں اپنے میلے کچیلے کپڑے دھو لیں گی۔ مگر خیالی سوال تو یہ ہے کہ ان ماماؤں کو تم اپنے ساتھ بٹھاؤ گی بھی؟"

"مجبوری کے تحت بٹھا لوں گی۔" رشیہ بولی۔

"ہاں بھئی لمبی لمبی بولیاں مت بولو۔" برکہ اس پر کچکچا کر دوڑی۔ "جی ایسا بھی ہو گا کہ ہم اگر نہیں پکائیں گے تو سو کھا کریں گے آپ اور بھتیا دونوں موٹاروں کو اللہ سلامت رکھے۔" رشیہ نے کہا۔

"لے چلنا ہے تو ویسے بولئے۔ ہم بھی اپنے سوٹ کیس درست کر لیں۔"

آفریں بولی: "مجھے بھی تو چھٹیاں ہیں۔ اس سے عمدہ موقعہ پھر نہیں ملیگا۔"

"ارے گھاس کھا گیا ہے بیٹے" توصیف بولے "میں تو جا رہا ہوں اپنا ہنی مون منانے۔ تمہارا ابھی دور ہے!"

"ہاں بھائی جان کیوں چاٹنے لگے آپ کباب میں ہڈی" برکہ نے برا مانا۔
"کچھ بھی ہو۔ میں تو ضرور چلوں گی۔ اوٹی کی سیر کا میرا بڑا جی چاہتا ہے" آفریں بولی۔

"ارے! زبردستی ہے کوئی" توصیف نے آنکھیں نکالیں "ہم لوگ بھلا اپنی تفریح کریں گے کہ تمہاری نگرانی کیا کریں گے۔ اور پھر اوٹی ایسا مقام ہے جہاں راستے کشادہ نہیں ہیں۔ گھاٹیاں ہیں، غار ہیں، کہرا چھایا رہتا ہے۔ کہیں گر گرا پڑو تو ہم بھی کسی کو صورت نہ دکھا سکیں!"

"ساتھ چلئے" عرشیہ نے شرارت سے کہا "کام کاج کی آسانی رہے گی"
عرشیہ بھی آفریں اور برکہ کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ اور دونوں ہی نے اسے توصیف کے لئے پسند کیا تھا! تینوں آپس میں اتنی گہری دوست تھیں کہ ان میں کسی بات پر بگڑنے کا سوال ہی نہ تھا۔

"میں آج ایک دن اور یونیورسٹی جاؤں گی" آفریں بولی۔

"ارے ہاں۔ تمہارے اس طرح کہنے پر یاد آیا" توصیف نے جلدی سے کچھ یاد کر کے کہا "شاید وہ تمہارے ہی مدعو کئے ہوئے تشریف لائے تھے۔ کون ہیں یہ مسٹر نزار احمد خاں۔ بہت بھاری شخصیت معلوم ہوتی ہے"

"کیوں؟" آفریں کا دل کچھ دھڑک کے ٹھہر گیا۔

"ارے ان حضرت نے مجھے ایک نہایت قیمتی قمری پیس سوٹ کا کپڑا نذر کیا۔ اور تمہاری بھابی کو جو گلوبند کا سٹ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ دس ہزار

سے کم کا نہیں ہے! ۔کیا یہ تمھارے ساتھ پڑھتے ہیں؟"

آفریں ششدر رہ گئی۔ کھوئی کھوئی سی بولی "نہیں۔ وہ تو پتہ نہیں کون کون سی ڈگریاں رکھتے ہیں۔ ایم فل، ایل ٹی۔ جانے کیا کیا۔ اب ریسرچ کر رہے ہیں!"

"تم سے دوستی کیونکر ہوئی؟" توصیف نے آفریں کو گھورا۔

"وہ۔ وہ میگزین کے ایڈیٹر بھی ہیں نا۔ اور میں میگزین میں افسانے لکھتی ہوں۔ بس اس طرح ـــ!" آفریں کو ان کا گھورنا ناگوار گزرا۔

"آپ بھی تو ان سے بہت گھلے ملے باتیں کر رہے تھے" بھڑک کر بولی۔

"کیا کرتا" توصیف بولے "انھوں نے آفریں کے توسط سے اپنا تعارف کرایا اور پھر آفریں کی تعریفیں شروع کر دیں۔

"میری تعریفیں شروع کر دیں" آفریں حیرت سے بولی۔

"ہاں" توصیف نے جواب دیا "تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ یونیورسٹی میں فضول باتوں میں وقت نہیں ضائع کرتیں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہو۔ مخلوط تعلیم کے نتیجہ میں وہاں بیہودگی عام ہے۔ لیکن تم آج تک کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں دیکھی گئیں۔

"چھی۔ توبہ۔ میں خدانخواستہ بوائے فرینڈ کیوں بنانے لگی" آفریں تنک کر بولی۔

"بنا لو بھئی ایک آدھ۔ تمھارے بھائی کو بہنوئی کی تلاش سے نجات ملے" عرشیہ نے لقمہ دیا۔

"بھابی۔۔۔" آفریں چیخی۔

اس شام دادی اماں باجرہ کو کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر لا رہی تھیں۔ برکہ کو حکم ملا تھا کہ راہداری والا بڑا کمرہ صاف کردے! لہٰذا وہ اپنے کام سے چلی گئی۔ آفریں نے یونیورسٹی کی راہ لی۔

وہاں پہونچ کر پتہ چلا کہ انگریزی اور لسانیات کے پروفیسر صاحبان تشریف نہیں لائے! وہ تین بجے تک فری تھی اور انجمن کی [illegible]۔ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کی طرح غفور میاں بھی جا چکے تھے!۔

اس نے سخت بیزاری محسوس کی۔ کیا کرنا چاہیئے۔ تین بجے تک۔ کچھ دیر وہ لیڈیز روم میں بیٹھی ان لڑکیوں کی باتیں سنتی رہی۔ جو موجودہ فیشن کے مطابق ملبوسات سلوانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ آخر وہ بڑے تاسف سے انھیں دیکھ رہی تھی وہ اونچے درجوں کی پڑھنے والی لڑکیاں تھیں۔ اور اسی مناسبت سے ان کی ترقی پسندی اور فیشن پرستی بھی تھی۔ وہ سبھی چست پتلونوں اور چست بلاؤزوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ذرا سی جنبش سے ان کے کسے ہوئے بدن تھرک اٹھتے۔ ڈھیر بھر بال گردن پر پڑے رہتے تھے۔ بازو عریاں کھلے ہوئے تھے۔ وہ اگر بے تکلفی سے ہاتھ اٹھا کر بال برابر کرتیں تو آفریں کی نظریں شرم سے جھک جاتیں۔ بھلا یہ اپنے معزز پروفیسروں کے سامنے بھی اسی طرح بیٹھ جاتی ہوں گی! وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ اس کا اپنا ماحول تو یہ تھا کہ اگر کہنیوں سے آستینیں ذرا اونچی ہو جاتیں یا قمیص اور بلاؤز کا گلا ضرورت سے زیادہ کھلا ہوتا تو امی ہرگز پہننے نہ دیتیں۔ اور نئے زمانے کے ڈیزائنوں کو صلواتیں سناتیں وہ مفت ہیں! تو پھر ان صاحبزادیوں کی مائیں نانیاں دادیاں کس طرح اجازت دے دیتی تھیں کہ وہ اس حیا سوز لباس

میں مردانہ تعلیم حاصل کریں اور خود ان کی حیا شرم کہاں جا کر غارت ہوئی تھی؟!!

ان کی گفتگو بھی نہایت عجیب تھی۔ برائے نام اردو میں نوّے فیصد انگریزی کی آمیزش۔ بیہودہ لہجہ۔ موضوع حیاسوز، لڑکوں کے چٹخارے بھرے تذکرے ناز ہاد نجبت کی گرما گرم کہانیاں:

اُف توبہ۔ آفریں کو ابکائیاں آنے لگیں تب وہ اٹھ کر سیمنار کیطرف ہولی: یہاں مکمل سکون تھا۔ خوشگوار نیم گرم فضا، دیوار گیر الماریاں مختلف کتابوں سے پر۔ سناٹا، علمی ادبی ماحول۔

وہ اپنے پروفیسر صاحب کی بڑی کرسی پر آ بیٹھی اور سامنے ٹی پائی پر پاؤں پھیلا دیئے۔ پھر وہ کہانی از سر نو پڑھنے لگی جسے آج نزار احمد خاں کو دینے کے لیے لائی تھی!۔

"ڈرتے ہوئے بیچارے : پتہ نہیں یہ عنوان اسے پسند آتا ہے کہ نہیں پھر وہ چونک اٹھی۔ کل سے یونیورسٹی بند ہے۔ آج کے سوا کوئی موقع نہیں۔ معلوم نہیں وہ بھی اپنے کمرے میں ہے بھی؟ اگر نہ آیا ہو تو۔

اس نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ تبھی اسے نزار احمد کا خاص چپراسی نظر آیا۔ آفریں پر نگاہ پڑی ہی تھی کہ وہ ادھر ہی پلٹا۔

ارے۔ بی بی آپ یہاں ہیں!۔ وہ خوش ہو کر بولا: میں آپ کو ڈیپارٹمنٹ میں دیکھ آیا ہوں اور اب صاحب کو یہ اطلاع دینے جا رہا تھا کہ آپ آج نہیں آئیں!۔

کیوں؟!! آفریں نے پوچھا۔

سوچا کہ اسے قطعی نروس نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ بولڈ بننا چاہیے۔ ہزار دریچے سے ہٹ کر اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ اور نیم باز آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگا۔ پھر دو تین لمبے لمبے کشوں میں اپنے سگریٹ کو ختم کر کے اس نے ٹکڑا ایش ٹرے میں ڈال دیا اور میز پر آگے جھک آیا۔

"فرمائیے۔ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں"

کیا یہ کبھی ہنستے مسکراتے بھی ہیں۔ سخت بگڑ کر آفریں نے دل ہی دل میں سوچا اور سر جھکا کر اپنی کتابوں سے افسانہ نکالا۔ اس کی طرف بڑھا دیا

شکریہ۔ بہت بہت شکریہ!" ہزار نے خشک لہجہ میں کہا: "آپ کو یاد تو رہا۔ اس روز تو خوب آپ نے مجھے اپنا منتظر رکھا تھا یقین مانیئے کہ میں شام کے سات بجے تک بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہا تھا!"

مگر میں اتنی دیر تک کیسے ٹہرتی؟"

آپ نے کہا تو تھا۔

جی۔ جی ہاں۔ لیکن بعد کو۔ مجھے بڑا ڈر لگا۔ آپ کو نہیں معلوم۔ جب تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی ہے تو امی بہت خفا ہوتی ہیں!"

اچھا اچھا۔ میں سمجھا۔ آپ نے کہا بھی تھا۔ دراصل مجھی کو خیال نہیں رہا۔ اور بعد کو۔ جب چپراسی کافی وغیرہ واپس لے آیا تو میں نے سوچا کہ شاید آپ جا چکی ہیں۔"

آفریں کا چہرہ گلابی ہو گیا: "معاف کیجئے۔ مجھے۔ یہاں کچھ کھاتے پیتے اچھا نہیں لگتا!۔ آپ نے برا مانا تھا!"

آفریں نے اس کے عنابی لبوں پر پوشیدہ تبسم کی لہر محسوس کی۔ ہاں

تھوڑا سا برا مانا تھا۔ آپ کسی کا خیال نہیں کرتیں۔ آپ کو دل رکھنا نہیں آتا۔"

جی۔؟ آفریں چونک سی گئی۔

میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آپ اور میں ایک دوسرے کے لئے نئے نہیں ہیں! چھوٹی چھوٹی باتوں میں اتنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے کہ کسی نامناسب سلوک سے کسی کا دل نہ دکھے۔ کیا آپ کو میرے اس نظریئے سے اتفاق نہیں ہے؟"

دفعتاً آفریں کو یاد آیا کہ ایک معمولی سی شادی میں اس نے کتنا گراں قدر تحفہ دیا تھا۔ آفریں کو خاصی ہتک محسوس ہوئی۔ شاید وہ اپنی امارت اُجاگر کرنا چاہتا تھا!۔

یہ تو یہی ہے! آفریں کچھ سرخ ہو گئی! لیکن یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کی دعوت قبول کر لوں اور نہ آپ کو دعوت نہ دوں۔"

ضرار کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ یہ تو آپ کی نیت پر منحصر ہے یقین مانئے کہ میں تو آپ کی دعوت کا منتظر رہنا چاہتا ہوں۔"

اس کی بے ساختہ ہنسی نے آفریں کو شرما دیا تھا۔ وہ سر جھکا کر اپنی کتاب کا ورق موڑنے لگی۔ اور تذبذب کے مارے اس کا کچومر نکال دیا۔

"ذرا میں آپ کی خامہ آفرینی کا شاہکار دیکھ لوں!" اس نے کہا۔

"میرے سامنے مت دیکھئے!" وہ بیساختہ بول پڑی۔

کیوں۔" وہ پھر مسکرایا۔

مجھے شرم آتی ہے۔ پتہ نہیں میں نے اس میں کتنی غلطیاں کی ہوں!"

اچھی بات ہے۔ نہیں دیکھتا! لیکن آپ ٹھہر جائیے دس پندرہ منٹ کے لئے!"

کیوں!۔

بس۔ یونہی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے،" ضرار نے ہولے سے کھانس کر کہا۔ آج سے تقریباً مہینہ بھر کے لئے جدا ہو جائیں گے تھوڑی دیر کا ساتھ نامناسب تو نہیں ہوگا!"

آفریں کچھ کہنے چلی تھی کہ ضرار کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بجانے کن کن چیزوں سے بھری ہوئی باسکٹ تھی وہ اس نے میز پر رکھ دی اور ڈرا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"آفریں!"

اس نے سر اٹھایا۔

"پلیز۔ برا مت ماننا"۔ اس نے بڑے دلآویز طریق پر نہایت اپنائیت سے کہا: "میں نے صبح کو ناشتہ نہیں کیا تھا"۔ اس نے اپنا کف سرکا کر کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی "اور اب۔ ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ کچھ لے آئے ہیں۔ سکندر خاں صاحب، دیکھو تو کیا کیا ہے۔ آج میں تمھاری بنائی ہوئی چائے پینا چاہتا ہوں"۔

"پھر آپ نے وہی تکلف کیا ہے"۔ آفریں بولی۔

"بالکل نہیں۔ یہ تو مجھے بھوک لگی ہے"۔

"تو پھر آپ ———"

اک تیوری سی بات کر تم بہت بڑھا رہی ہو۔ معاف کرنا میں تمھاری

اجازت کے بغیر بے تکلف ہو گیا ہوں۔ تم کچھ محسوس تو نہیں کر رہیں!" اور آفریں کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے تائید چاہی کی! "میں تم سے عمر میں کافی بڑا ہوں۔ بہرحال، برا مان رہی ہو تو کہہ دو۔"

وہ ہنس کر اٹھ گئی۔۔ اور جب وہ اس کی طرف پیٹھ کیے باسکٹ سے الم غلم چیزیں نکال کر پلیٹوں میں رکھنے لگی تھی تب پوچھا۔

"آج صبح ناشتہ کیوں نہیں کیا آپ نے؟"

وہ بجی۔ "مجھے ڈیڈی سے جھگڑا ہو گیا تھا" وہ گونج دار آواز میں ہنسا۔

آفریں نے پلیٹیں لا کے اس کے سامنے سجا دیں۔ اور تعجب سے آنکھیں پھیلا کر بولی "آپ اتنے پڑھے لکھے۔ مطلب یہ کہ۔ اپٹو ڈیٹ آدمی ہیں اور ڈیڈی سے جھگڑا کرتے ہیں۔"

ہاں وہ کچھ ہو ہی گیا۔" اس نے نظریں اٹھا کر آفریں کو دیکھا۔ بیٹھ جاؤ۔ شرمانے یا تکلف کرنے کی بالکل ضرورت نہیں!۔

"مگر میں تو خوب اچھی طرح کھا پی کے آئی ہوں۔"

کوئی حرج نہیں۔ میری خاطر تھوڑی سی گنجائش تو بہرحال نکل ہی آئے گی۔"

وہ مزید انکار کا مظاہرہ نہ کر سکی۔ اور سامنے آ بیٹھی۔ اتنے میں سلندر خاں پانی اور چائے کا سامان لے کر آ گئے۔

آپ آفس سے پروف ریڈر صاحب کو بلا لائیے" فراز نے چپراسی سے کہا۔ آفریں کے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اسے بھگانا چاہتا تھا۔

"انسان کو کبھی کبھی کوئی معمولی سی بات کتنی بے پایاں مسرت بخش دیتی ہے۔ اب مثال کے طور پر۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ــــ خیر ہاں۔ آفریں تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ۔ ڈیڈی سے میرا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

اس خیال سے نہیں پوچھا کہ پتہ نہیں آپ کیا سوچیں؟" وہ بڑے تکلف سے ایک بادام کتر رہی تھی۔ ضرار نے اس کے سامنے دو تین پلیٹیں سرکا دیں!۔

دراصل ڈیڈی بیچارے بھی کچھ غلط نہیں کہتے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ کتنی بدنصیبیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ آفریں۔ جب میری عمر پانچ سال کی تھی، تبھی امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کا چہرہ مجھے بالکل اس طرح یاد ہے جیسے دھند میں لپٹا ہوا کوئی خیال۔ پھر ڈیڈی نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی............ یہ کیا۔ تم نے اپنا ہاتھ روک لیا۔"

"آپ کے لئے چائے بنا دوں!"

"میری کہانی سننا نہیں چاہتیں!"

آپ کی کہانی بڑی پُر درد ہے"

حساس دلوں کے لئے۔ ورنہ ان واقعات میں کچھ نہیں رکھا.....

بے چارے ڈیڈی تنہائی کا مقابلہ کرتے کرتے اب ہار گئے ہیں۔ پہلے تو وہ اپنا بزنس دیکھتے تھے۔ ٹیکسٹائل مل سے دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن کب تک۔

اب ان کی واحد تمنا یہی رہ گئی ہے کہ وہ اپنا گھر آباد کریں"

ہر باپ کی یہی تمنا ہوتی ہے۔ اب دیکھئے کہ بھائی جان نے تعلیم حاصل کر لی، ملازم ہو گئے۔ اور ابا جان نے ان کی شادی کر دی۔ بڑے بھولپن

سے آفرین نے مثال پیش کی۔

"تو تم سمجھ گئیں کہ ہمارا جھگڑا اقرار وانکار کی نوعیت کا تھا۔"

"بجا ارشاد"

انھوں نے کئی تصویریں مجھے دکھائیں۔ لیکن تصویروں سے کیا ہوتا ہے۔ "اصلی خدوخال دیکھنا، سیرتوں کا مشاہدہ کرنا اور عادات واطوار کا پرکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔"

"آپ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔"

"نہیں!" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ اور کیک کا بڑا سا پیس اس کی طرف بڑھایا۔

"اب مجھ سے نہیں چلے گا۔" آفرین شکست خوردہ سی ہنس پڑی۔

"چلے گا۔" اس نے زبردستی پیس اسے تھما دیا۔ اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

"تم تو جانتی ہو۔ میں قدامت پر جان دیتا ہوں۔ مجھے قدیم لباس، مشرقی شرم وحیا اور زیر لب کی جانے والی گفتگو پسند ہے۔ ترقی پسندی فیشن پرستی کو میں موجودہ دور کی سب سے بڑی لعنت سمجھتا ہوں۔ اور بس۔ میری مشکل پسندی ڈیڈی کو ناگوار گزرتی ہے۔ وہ بگڑتے ہیں کہ اپنی پسند کی تلاش میں میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ اور وہ خدانخواستہ دنیا سے چل دیں گے۔"

"سچ تو ہے۔ اپنی مرضی اور پسند میں تھوڑی سی ترمیم کیجئے۔ ایسی لڑکی آپ کو کہاں ملے گی جو مشرقیت کا مکمل نمونہ ہو۔"

دیکھی تھی کہیں ایک۔ لیکن ـــــ"

"لیکن۔۔" آفریں کے ہاتھ سے بیں پھسلنے لگا۔ شاید اسے ضرار کی ناکامیوں ہی سے پیار تھا۔ وہ اسے کامیاب و کامران دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا رنگ یکبارگی سفید ہو گیا اور اسے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنی پڑی۔"

کیا نہیں آپ نے؟" اس نے بمشکل آواز ابھاری۔ "کون تھی وہ لڑکی۔ اور اب کہاں ہے؟"

پتہ نہیں۔" ضرار نے ایک طویل سانس لی اور رومال سے ماتھا پونچھنے لگا۔ "کہاں چلی گئی۔ کہاں ہے؟"

"نام پتہ کچھ نہیں پوچھا آپ نے؟"

نہیں!۔

اب میں سمجھی!۔

کیا سمجھیں!

آپ اس لڑکی ہی کی خاطر دوسری لڑکیوں کو نہیں دیکھتے۔ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ تبھی تو لڑکیوں میں آپ مغرور مشہور ہیں!"

اچھا؟۔" اس نے بڑی حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ میں نے تو اپنی سہیلیوں سے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کو لڑکیوں سے نفرت ہے!!"

"صرف ان سے۔ جو دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے خود کو ظاہر کرتی ہیں۔"

آپ سے ایک بات پوچھوں!"

"ضرور۔ ضرور؟"

"سنا ہے کہ ڈاکٹر اسحٰق کی لڑکی مریم نے آپ کی بے التفاتی کے غم میں خودکشی کر لی تھی!"

"تم ہی سوچو آفریں کہ مجھے بدنام کرنے کے لیے سب نے کیسی ناقابلِ یقین کہانیاں گڑھ لی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ ان دنوں تو میں لندن گیا ہوا تھا۔ بعد کو یہاں آیا تو یہ بیہودہ افواہ سنی!"

"لیکن مریم نے ۔۔۔!"

"ہاں۔ مریم نے خودکشی ضرور کی تھی۔ لیکن میں اس کی وجہ نہیں جانتا خیر۔ اس پر لعنت بھیجو۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہوگی!"

چائے کے دوران آفریں کو خیال آیا کہ اس یونیورسٹی میں بات کا بتنگڑ۔ اور پر کا کوا بنتا ہے۔ جب لوگوں نے ضرار جیسی بااثر شخصیت کو بھی کسی نہ کسی طرح ملوث کر دیا ہے تو پھر سے بیوقوف بنانا کیا مشکل ہے۔ اسے اس گمنام پرستار کا خیال آ گیا جس نے خط لکھ لکھ کر اس کا آدھا خون خشک کر ڈالا تھا! اس نے سوچا کہ اس بدمعاش خبیث کا تذکرہ ضرار سے ضرور کرنا چاہیے۔ اور بس اس نے کچھ گلوگیر آواز میں من و عن اپنی پریشانی کی داستان اس سے کہہ دی اور آخر میں بولی۔

"اگر وہ خط کبھی ابا جان یا بھائی جان کے ہاتھ لگ گئے تو سوچیے کہ میری کیا پوزیشن ہوگی۔ وہ لوگ سوچیں گے کہ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے تبھی تو اس کی جرأت اتنی بڑھ گئی ہے۔ وہ میری کسی تاویل پر یقین نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ گھر ہی بٹھا لیں۔۔۔۔ آپ اتنے عرصے سے یونیورسٹی

میں ہیں۔ اگر آپ کوشش کیجئے تو یقیناً پتہ چلالیں گے کہ وہ کون ہے جو خواہ مخواہ میری نیکنامی کا دشمن ہوا ہے۔"

"تم پہلے ہی مجھے ہلکا سا اشارہ کردیتیں آفریں۔ اب تک کیا سوچتی رہی تھیں!۔ تم نے بڑی بھول کی۔ خیر۔ جب یونیورسٹی دوبارہ کھلے گی تب میں ضرور پتہ لگاؤں گا۔ اور اسے سزا دوں گا۔ اس کا کوئی خط اس وقت ہے تمہارے پاس؟!"

"اس وقت تو نہیں ہے"۔ آفریں نے خجالت اور ندامت کے مارے سر جھکا لیا۔ ضرار کی نگاہیں اس پر پڑیں۔ شاید یہ خود بھی اپنے معصوم حسن سے بے خبر ہے۔ شفاف رنگت جیسے صبح ازل میں شفق کی گلابیاں پگھل گئی ہوں۔ گلاب کی پتیوں کے رس میں ڈوبے ہوئے خوشنما لب، شب دیجور جہاں سو رہی تھی ایسے بال، لمبی لمبی گھنی کالی کالی پلکوں سے لدی پھندی آنکھیں کون کمی دست قدرت نے باقی نہیں رکھی! معصومیت قیامت۔ سادگی دل لوٹ لینے والی، بے خبری گھائل کرنے والی!۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور ضرار سر جھکا کر سگریٹ سلگانے لگا۔

دفعتاً سکندر خاں کالے دیو کی طرح ان کی خلوت میں آ کودے۔

"صاحبزادی آپ کا رکشا آگیا ہے"۔

آفریں میز پر سے کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

اب میں چلتی ہوں"۔ وہ مسکرا کر بولی: "بیس دن بعد پھر ملوں گی"۔

اچھا خدا حافظ!"۔ ضرار اس کے ساتھ کھڑا ہوا اور مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن آفریں نے شرما کر کہا۔

نہیں۔ مجھے شرم آتی ہے"۔ اور اس کی طرف دیکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ صرار پتھر کے بُت کی طرح جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا!!"

دادی اماں بذات خود جاکر اپنی جلا وطن ہو یا جرہ کو اپنے گھر لے آئیں۔ ان کے ساتھ میجر صاحب اور اظہار بھی آئے! توصیف کو بتانے کی جلدی تھی۔ لہٰذا وہ منہ بھر کر اور آفریں کے میسور کی سیر کو چل دیئے۔ وہ تنہا نہیں گئے۔ ان کے ساتھ اظہار بھی تھا!۔ اس کی شوخی شرارت اور بذلہ سنجی کی بنا پر توصیف اسے بہت پسند کرتے تھے۔

میسور میں انہوں نے ایک ڈاک بنگلہ میں قیام کیا تھا۔ دن بھر شہر کی سیر کیا کرتے پھرتے اور رات کو تھکے ہارے آکے سو رہتے۔ چوکیدار کی بیوی ان کے لیے کھانا تیار کر دیتی!۔

تیسرے دن وہ لوگ اوٹی چلے گئے!۔

اور جہاں قیام کیا وہ جگہ بڑی پُر فضا تھی۔ ایک طرف جنگلی پھولوں کے حد نظر تک بکھرے ہوئے کنج۔ دوسری طرف سرسبز کائی سے ڈھکے ہوئے پہاڑ۔ اور نظروں کو اُلجھا دینے والا گہرا کہر۔

وہ میدانوں سے آئے تھے اور اب سردی کی شدت مزاج پوچھ رہی تھی دن کے دس بجے انہوں نے ناشتہ کیا اور گھاٹیوں کی سیر کے لئے روانہ ہوگئے گھاٹیوں پر بنی ہوئی پتلی سی سڑک بڑی ڈراؤنی اور خطرناک تھی۔ اگر بس

کا توازن بگڑتا تو وہ میلوں گہری کھائی میں جا گرتی۔ نیچے گھنے گھنے درخت تھے جن میں بادلوں کی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کھائیوں کے کنارے سر بفلک پہاڑ بادلوں میں گم تھے۔

بس آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی!۔ اس مقام پر حادثے بھی ہوا کرتے تھے۔ لڑکیوں نے گرم سوئیٹروں میں خود کو ملفوف کر لیا تھا۔ لیکن ان کے جسم کپکپا رہے تھے!۔ اظہار باقاعدہ دانت بجا رہا تھا! اور لڑکیوں کو اس کی ہیئت کذائی پر ہنسی آ رہی تھی!۔

توصیف بھائی!" وہ باقاعدہ تھر تھر کانپتا ہوا بولا۔" یہ آپ کا ہنی مون ہے کہ ہماری سزائے بامشقت، میں تو اپنا ہنی مون منانے ادھر کبھی نہیں آؤں گا۔ حال یہ کہ آنتیں بے چاریاں لحاف لحاف چلّا رہی ہیں! ہو ہو ہو یہاں کا سورج بھی ٹھنڈا نکلتا ہے کیا؟"

"واقعی سردی تو بہت ہے!" توصیف ہنستے ہوئے بولے۔

"آپ اپنا ہنی مون افریقہ میں منائیے گا اظہار بھائی۔ اس ٹھنڈک کی مداوا ہو جائے گا۔" آفریں بولی۔

"تب تک میری آئسکریم نہ جم گئی تو۔ اور پھر پتہ نہیں۔ برکہ کو کون سی جگہ پسند ہے؟" اظہار بولا۔

"ذرا ہوش میں۔ مجھ سے کیا مطلب؟" برکہ بگڑی۔

"ارے! نام تک لینا مصیبت ہے۔ بھائی جیسے تم نے بھابی کو یہاں آنے کا مشورہ دیا ویسے میں سمجھتا تھا کہ میری دلہن کو بھی کوئی مفید مشورہ دو گی کیونکہ تم تو یہاں آتے ڈرتی ہو"، اظہار نے تاویل پیش کی۔

انھار بھیا۔ اب چونچ نہ کھولنا۔ یہاں اکیلے ہم ہی تو نہیں ؛" عرشیہ نے اسے ڈانٹ پلائی۔

او۔ کے بھابی۔ آپ کا حکم ضرور مانوں گا" یہ وہ مؤدب ہو بیٹھا۔ اچانک انھار کو پھر ہنسنے کا موقعہ مل گیا۔ بس نے ایک موڑ کاٹا اور ذرا سی ترچھی ہو گئی برکہ جو شروع ہی سے بس کے لڑھک جانے کا خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ نجانے کیا سمجھی کہ شاید بس گر رہی ہے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور چونکہ انھار کے عین سامنے بیٹھی تھی۔ رکوع کے پیرایہ میں جھک کر اس کی گود میں جا پڑی۔

سب مسافر چونک کر اسے دیکھنے لگے :۔

کیا ہوا۔ کیا ہوا کا شور مچ گیا۔

انھار نے بڑی فراخدلی سے اسے دبوچ رکھا تھا!۔ توصیف کو ہنسی ضبط کرنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی مگر اوروں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو رہا تھا۔

برکہ صورت حال سے واقف ہو کر پسینے پسینے ہو گئی۔ اس نے جل کر اور شرمندہ ہو کر ایک تیز چٹکی انھار کے بازو میں لی اور مچل کر پھر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

میں تو یہاں سے اٹھ جاتا ہوں بھالی :" بازو سہلاتا سی سی کرتا اور برے برے منہ بناتا ہوا انھار بولا "ابھی تو کچومر ہی نکال دو گی "

برکہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ توصیف کو جھنجوڑ کر ہنستی۔

"آپ کچھ نہیں بولتے۔ جب میں اس پر گری تھی تو یہ میرے کان میں بولا تھا کہ خوش آمدید خوش آمدید"، اور رونے لگی۔ توصیف کا قہقہہ آزاد ہو گیا۔

"ابے بدمعاش"! وہ صرف یہی کہہ سکے۔ پھر خود پر قابو پا کر بولے "بیٹا اترو تو نیچے۔ پھر مزہ چکھاؤں گا"!

خدا خدا کر کے ہر کہ کا ہولناک سفر ختم ہوا۔ سب ٹورسٹ اپنے اپنے کیمرے تھرماس اور ایئر بیگ سنبھالے اُترے۔ یہ بھی اترے۔ اور منظر کا لطف لیتے ہوئے آگے چل پڑے۔ ماحول بے حد عجیب تھا۔ ان کے ارد گرد گھنے گھنے جنگل تھے۔ کہیں کہیں گھاٹیاں تھیں اور کہیں اتنی تنگ پگڈنڈیاں کہ انھیں قطار بنا کر چلنا پڑتا تھا۔ ہُر ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آسمان بھورے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن دھوپ کی غیر مرئی سی کرنیں زمین تک پہونچ رہی اور دھند کو ابخرات بنا کر اوپر اڑا رہی تھیں۔

یہ سب چیزیں انسانوں نے بنائی ہیں کہ اللہ میاں نے کیوں بھائی جان!"! آفریں نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔ بچپن سے اس کا یہی حال تھا۔ کوئی ندی، تالاب سمندر یا پہاڑ دیکھتی تو فوراً استفسار کرتی۔ اسے انسانوں نے بنایا ہے کہ قدرت نے۔ چنانچہ ابھی توصیف کچھ کہہ نہ سکے تھے کہ اظہار بولا: "اللہ میاں اب کچھ نہیں بناتے۔ آپ کو بنانے کے بعد انھوں نے ہاتھ روک لیا"!

آفریں دل کھول کر ہنسی۔ وہ مذاق کا نشانہ بنتی تھی تو برا نہیں مانتی تھی!

میں کہیں رک کر کافی پیوں گی"۔ عرشیہ نے کہا: "سر چکرا رہا ہے۔"
"متلی تو نہیں ہو رہی؟" اظہار نے بڑی تشویش سے پوچھا۔
عرشیہ اس کا مطلب سمجھے بغیر بولی: "کچھ کچھ ہو تو رہی ہے!"
اظہار اچھل پڑا: "مبارک ہو۔ یہ تو بڑی عمدہ خوشخبری ہے۔"
عرشیہ اس کا مفہوم سمجھ کر اسے مارنے جھپٹی۔ توصیف مسکرانے لگے۔
"کمینے بے شرم!" عرشیہ رک کر ہانپنے لگی "جو جی چاہتا ہے بک دیتا ہے۔"
"بیوی تو میں نے کیا بری بات کہی"۔ اظہار بولا۔ دور جا کھڑا ہوا تھا۔ دفعتاً برکہ پھر اچھل پڑی اور آفریں کے کندھے پر جھپٹا مار کر بولی: "وہ ادھر دیکھو کتھئی گاڑی!"
"کتھئی گاڑی۔ کہاں؟" آفریں گھبرا کر بولی اور برکہ کی نظروں کی متابعت میں ادھر دیکھنے لگی جہاں گھنی جھاڑیوں کے سائے میں جانی پہچانی کتھئی کار کھڑی تھی! پھر گاڑی میں متبسم شخصیت بھی دکھائی دی۔
"یہ بھی یہاں آ گئے"۔ برکہ نے سرگوشی کی "تم انھیں اطلاع دیکر یہاں آئی تھیں؟" آفریں نے نفی میں سر ہلایا ہی تھا کہ برکہ بے اختیار پکار اٹھی۔
"اے ضرار بھائی!"
ضرار کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ اس نے حیرت سے ان لوگوں کو دیکھا اور پٹ کھول کر نیچے اتر آیا۔ تب تک یہ چھوٹا سا قافلہ اس تک پہونچ گیا۔
"ہیلو مسٹر ضرار"۔ توصیف نے ہنستے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہیلو مسٹر توصیف ۔" ضرار نے توصیف کا ہاتھ گرمجوشی سے اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔"بخدا بڑی مسرت ہوئی آپ سب کو یہاں دیکھ کر۔ کب آئے ۔"

تین روز ہوئے "۔ توصیف نے کہا ۔

اچھا اچھا"۔ اس نے سر ہلایا۔

یہ میری نصف بہتر "۔ توصیف نے ضرار سے عرشیہ کی طرف اشارہ کر کے تعارف کیا۔" بدتر نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ خواتین کے گروپ میں اکیلا ہوں "۔

ضرار نے ہنستے ہوئے عرشیہ کے سامنے سر جھکایا۔" آپ مجھ سے بہت چھوٹی لگتی ہیں۔ بھابی نہیں کہوں گا۔ برا نہ مانیے تو بہن کہوں اور آپ کا نام لوں "۔

بڑی خوشی سے بھائی صاحب "۔ عرشیہ بولی کچھ کم بولڈ نہ تھی ۔

اور میں آپ کا ہم زلف ہوں! "۔ اظہار نے بڑی مستعدی سے کہا۔

ہم زلف؟ "۔ ضرار نے حیرت سے کہا۔

جی ہاں۔ جیسے ہم مدرسہ، ہم درد، ہم عصر، ویسے ہی ہم زلف "۔ اظہار نے تشریح کی "۔ آپ میں مجھ میں زلفیں ہی تو قدر مشترک ہیں ۔ ۔ زاں بعد یہ کہ خاکسار کا اسم گرامی محمد اظہار حسن ہے ۔ تعلیم ماسٹر آف کامرس۔ عمر پچھتر کم سو سال۔ الا ماشاء اللہ! "۔

خوب خوب۔" ضرار نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"کوئی تعارف نہیں مانگ رہا تھا خواہ مخواہ ہر ایک کے بیچ میں کود پڑتے ہیں "۔ بہرکہ ابھی تک جلی ہوئی تھی۔ اظہار کی متبسم شکل دیکھ کر اس

کی ہڈیاں اور بھی سلگ رہی تھیں۔

نکاح سے پہلے یہ عالم "، اظہار عزار کے کان میں گنگنایا "، نکاح کے بعد تو مجھے گھنگھرو پہنا کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیں گی اور ہاتھ میں ڈگڈگی دے دیں گی "۔ اللہ بچائے!"

برکہ نے اس کی کھسپھساہٹ سن لی اور اس پر چڑھ دوڑی۔

"بندر۔"

"بندریا" اظہار ہاتھ نچا کر بولا۔

غصے میں کانپتی ہوئی برکہ جھک کر پتھر ڈھونڈنے لگی۔

"بچاؤ۔ بچاؤ"۔ اظہار اپنی جگہ کھڑے کھڑے چیخا۔

برکہ کو پتھر نہ ملا تو وہ توصیف پر چیخی "آپ ساری حماقتیں دیکھ رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں بولتے؟"

"اظہار!" توصیف نے ڈانٹا۔ "بیٹے اب چپ بیٹھ" "اظہار میاں۔ بہنوں کو نہیں ستاتے۔" عزار نے کہا۔

"بزرگوں کے اس مجمع میں مجھے واقعی چپ رہنا چاہیئے" وہ بولا اور ایک قہر آلود نظر برکہ پر ڈال کر منہ پھیر لیا۔

"آپ یہاں کب آئے؟" آفریں نے عزار سے پوچھا "مجھ سے آپ نے کہا ہی نہیں تھا ورنہ میں بھی بتا دیتی کہ ہم لوگ بٹیا کے ساتھ یہیں آرہے ہیں۔"
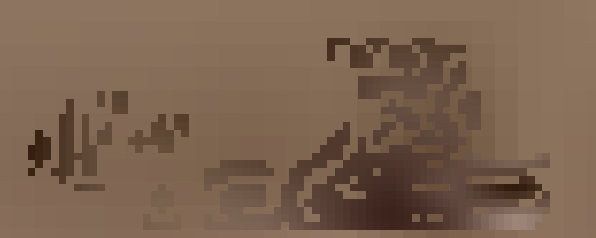
"بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ اس وقت میرا کوئی ارادہ نہیں تھا" عزار نے کہا۔ "ورنہ میں ضرور تذکرہ کرتا۔"

اب آپ کے ڈیڈی کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ۔ اب تو بالکل ٹھیک ہیں!" ضرار نے خشک لہجے میں کہا پھر توصیف سے بولا "ہاں۔ یہ آپ نے نہیں بتایا کہ یہاں آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"بھائی ادھر میدان میں ایک چھوٹا سا دیہاتی ہٹ ہے!" توصیف نے بتایا۔ "وہی ہفتہ بھر کے لئے انگیج کر لیا ہے۔"

"تو پھر ایک درخواست ہے جناب!"

"فرمایئے۔"

"یہاں اس پہاڑی کے قریب میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے!" ضرار نے کہا۔ "اب جب کہ غریب خانے کی سہولت موجود ہو تو آپ خواہ مخواہ تکلیف کیوں اٹھائیں۔ میری گزارش ہے کہ ہفتہ بھر ہم سب ساتھ رہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"مگر بھائی صاحب۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو ہمارے قیام کے سلسلے میں کوئی تکلیف ہو۔" توصیف نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اس میں تکلیف اور زحمت کا کیا سوال ہے!" ضرار نے پرزور لہجہ میں کہا۔ "وہاں میں اکیلا ہی تو رہتا ہوں۔ آپ سب کے قیام سے چہل پہل ہو گی۔ مزید برآں۔ خواتین کو کچن کی مصروفیات سے بھی نجات مل جائے گی۔ میرا ملازم ساتھ آیا ہے۔ وہی ہم سب کے لئے کھانا تیار کر دیا کرے گا۔" پھر وہ مسکرا کر عرشیہ سے مخاطب ہو گیا۔ "آپ کی کیا رائے ہے۔ بیگم توصیف؟"

آپ کی جو مرضی بھائی صاحب !" وہ اپنے بھاری بھرکم سلطاب سے شرما گئی۔

"ل. لیکن !" توصیف ہکلائے۔

"اب لیکن ویکن کی الجھنوں میں نہ پڑئیے !" ضرار جلدی سے بولا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا سارا سامان۔ مطلب یہ کہ —— !"

اور تب ضرار نے معنی خیز نگاہوں سے اظہار کی طرف دیکھا۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا لگا کہ سب کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اظہار قدرے جھینپ گیا تھا لیکن مستعدی سے بولا "میں تیار ہوں۔ لیکن یہاں میں نے دیکھا کہ ہر مزدور کے ساتھ ایک مزدورنی بھی ہوتی ہے۔ بھابی کو الگ کر کے اگر کوئی مزدورنی میرے بھی ساتھ چلتی تو —— !"

"یار اب سچ مچ تم پٹ جاؤ گے !" توصیف نے کہا۔ پھر کیمپ ضرار کے ساتھ قیام طے ہو گیا۔ وہاں ایک سرسبز ٹیکرے پر بیٹھ کر ان سب نے نمکین تلے ہوئے کاجو اور خشک میوے کا ہلکا پھلکا ناشتہ کیا۔ کافی پی۔ پھر ضرار ان سب کو لے کر چلا گیا۔ اور اظہار کو اسباب لانے بھجوا دیا گیا۔

ضرار نے ازراہ کسر نفسی اپنے گھر کو غریب خانہ کہا تھا۔ حالانکہ یہ بڑی عمدہ بے حد آرام دہ کوٹھی تھی۔ ضرار نے انھیں پوری کوٹھی دکھائی۔ پھر وہ لوگ مختلف مشاغل لے بیٹھے۔ توصیف اور ضرار کارڈز کا کوئی مشکل سا کھیل کھیلنے لگے۔ آفریں اور بہر کر ادنچے دریچے میں بیٹھی دوربینیں لیے باہر کے مناظر کی سیریں کرنے لگیں۔ دو ایک گھنٹے بعد اظہار اسباب لے کر آگیا۔ وہ ضرار کا عمدہ اور خوبصورت ٹیپ ریکارڈر لے کے بیٹھ گیا ! ان کا سیٹ

بڑا صاف ستھرا تھا۔ ایک بڑا قیمتی ذخیرہ غالب کی ان غزلیات کا تھا جو مختلف فنکاروں نے گائی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈر آن ہوا اور پھر ایک سماں سا بندھ گیا۔ حقیقی معنوں میں تفریح کا لطف انھیں اب آیا تھا۔
دوپہر کا کھانا بڑا پر تکلف تھا!۔ لیکن ضرار کی خوش مزاجی، بے تکلفی انھیں کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیتی تھی۔ اس نے اپنے خلوص میں انھیں جکڑ لیا تھا۔ آفریں اسے بالکل بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ بات بات پر ہنس رہا تھا اظہار کے بچکانہ لطیفوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ عرشیہ سے باتیں کر رہا تھا! اور توصیف کے ساتھ بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ جیسے برسوں سے دونوں کا ساتھ رہا ہو۔ بے حد کم عرصہ میں دونوں آپ اور جناب کے حجابات اٹھا کر تم پر آ گئے تھے۔ اگر ضرار نے توصیف کو بہت پسند کیا تھا تو توصیف بھی اس کے بے تحاشہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ اظہار تو ان سے عشق کرنے لگا تھا!۔

عرشیہ اور برکہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھیں۔ ان کا تمول وامارت اس بے لوثی اور سادگی کا متقاضی نہ تھا!۔ امیروں میں تکلف، اور غرور کی بو آ ہی جاتی ہے۔ لیکن ضرار کی سادگی دل موہ لینے والی تھی۔ وہ اپنے ہر سلوک پر اتنے شرمندہ ہوتے تھے جیسے وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ کر سکنے پر محجوب وپشیمان ہوں!۔
اگر متحیر تھی تو آفریں۔ جس نے یونیورسٹی میں ضرار کا بڑا محتاط، خشک اور متکبرانہ روپ دیکھا تھا! وہاں اس کے گنے چنے دوست تھے۔ کسی سے ہنس کر بولنا تو درکنار وہ سیدھے منہ نہیں بولتا تھا۔ لڑکیوں پر

خاص کر ایسی حقارت آمیز نظریں ڈالتا جیسے اس صنف کو دنیا کی اسفل ترین چیز سمجھتا ہو۔ لیکن یہاں۔ وہ حیران تھی۔ کون سا روپ اصلی تھا۔ وہ یا یہ؟۔ ویسے وہ اس سے بے حد متاثر ہو رہی تھی!۔ ضرار کی شخصیت مقناطیس ثابت ہو رہی تھی۔ اور آفریں جیسے خود پر غرور تھا کہ وہ کسی سے مرعوب یا متاثر نہیں ہوتی۔ خود بخود کھنچی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ضرار کے قریب رہے۔ ان کی شخصیت کا سحر اس پر چھا تا جائے۔ وہ لہجے جاوداں ہو جائیں۔ ان کی دلکش بھاری اور نرم آواز اس کے کانوں کی راہ اس کے دل کی سونی وادیوں میں ہمیشہ ہمیشہ گونجا کرے۔ ان کی متبسم شکل وہ اپنے لوحِ دماغ پر ابد تک کے لئے مرتسم کر لے۔

اور حتیٰ کہ وہ ان سے وابستہ ہو جائے!۔

اپنے خیالوں پر وہ شرمسار بھی تھی اور پریشان بھی۔

اگر ان انوکھے خیالوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو پھر۔

ابھی کیا! ان کی راہیں الگ منزلیں جدا ہو جائیں گی۔

اور ضرار کی سی بھاری بھر کم شخصیت بھلا اس کی سی موہوم و معدوم لڑکی کو کیا خاطر میں لائے گی۔ کیا وہ ہمیشہ ان کے کمرے کے چکر کاٹا کرے گی؟ ان سے باتیں کرنے کے موقعے ڈھونڈے گی؟ ان کی چشم التفات کی پیاسی رہے گی؟۔ آخر وہ کیا کرے گی۔ اگر ان تکلیف دہ خیالوں نے اسے زیادہ تنگ کیا؟۔

رہ رہ کر اسے مریم یاد آتی۔ جس نے خودکشی کی تھی۔ ضرار لاکھ انکار

کریں تو کیا۔ کوئی خواہ مخواہ اپنی جان پر نہیں کھیل جاتا!۔

تو مریم کا سا انجام کیا اس کا بھی مقدر رہے ہے؟۔

وہ امکان بھر کوشش کرتی کہ کسی کو اس کے انداز بدلے ہوئے نظر نہ آئیں خود کو چھپانے کی کوشش میں اس نے نادانستہ خود کو اُجاگر کرنا شروع کر دیا۔

اس روز انھوں نے تمام شہر گھوم پھر کر خود پر تھکن لاد لی تھی۔ سرِ شام ہی سے کھانا کھایا اور اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ ایک بڑا کمرہ توصیف و عرشیہ کے لئے مختص تھا۔ ایک کمرے میں آفریں اور ببر کہ سوتی تھیں۔ اظہار کے لئے الگ کمرہ تھا اور آخری مردانہ حصے میں ضرار نے اپنا انتظام کیا تھا۔

رات کے آٹھ ہی بجے تھے کہ سب نے خراٹے لینے شروع کر دئے۔ آفریں اکیلے اپنے بستر پر پڑی جاگ رہی تھی۔ کمرے میں ہلکا سا نیلگوں خواب آور بلب روشن تھا۔ دور و نزدیک گہرے سناٹے کی حکمرانی تھی۔ ہوائیں تو کہیں دور گرج رہی تھیں۔ اور طوفان اس کی ہستی کے اندر اُٹھ رہے تھے!۔ کمرے کے باہر پالا منجمد تھا۔ لیکن آفریں کا کا ہیدہ بدن تپ رہا تھا!۔ پیاس کی شدت نے زبان پر کانٹے سے ڈال دئے تھے۔ لب خشک تھے اور حلق سوکھ گئی تھی اس نے چنگاریاں برساتا ہوا کمبل اپنے اوپر سے اچھال پھینکا اور سرہانے سے دوپٹہ اٹھا کر کندھوں پر ڈالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

مگر مجھے جانا کہاں ہے؟" وہ بند دروازے کے پاس ٹھٹھک گئی۔ اس برف برسانی سردی میں باغ میں جانا بھی پاگل پن۔ دیوانوں کی طرح سارے گھر میں منڈلاتے پھرنا بھی حماقت، اور پھر آدھی رات قریب ہے۔ کسی نے اسے یوں آوارہ روح کی طرح یہاں وہاں پھرتے دیکھ لیا تب ــــ؟ اور وہ چاہتی بھی

کیا تھی! اس نے خالی خالی نظروں سے برکہ کو دیکھا جو کیبن میں دبکی معصوم بلی کی طرح سو رہی تھی اور ننھے منے ناز ک ناز ک سے خراٹے لے رہی تھی۔ آفریں کے سینے سے ٹھنڈی سانس نکلی۔ بے فکری کی نیند بھی خدا کی نعمت ہے جس سے وہ فی الحال محروم تھی!۔

دفعتاً اس نے کمرے کے پیچھے برآمدے میں ایسی آہٹ سنی جیسے کوئی محتاط قدموں سے چل رہا ہو!۔ وہ تیزی سے پلٹی اور کھڑکی کی درازسے آنکھ چپکا دی۔ فرط خوف سے اس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے پھوٹ آئے تھے اور دل ہاتھوں پیروں میں دھڑک رہا تھا!۔

ایک طویل قد آور سایہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ کر لائبریری کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ اس نے اس تھیم سائے کو آنکھوں سے ناپا اور پھر بے اختیار دروازہ کھول کر باہر نکل گئی!۔

اظہار کے چھوٹے کمرے کے سامنے اس نے ضرار کو جالیا۔

آپ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔" وہ مسکرانے کی کوشش میں ہانپتی ہوئی بولی۔

میں نے ؟!" ملگجی روشنی میں گھلا ملا وہ آفریں کو کہیں بھاری بھرکم اور طویل قامت لگ رہا تھا۔ پہلی دفعہ آفریں نے اسے گھر کے لباس میں دیکھا معمولی سا پر شکن پاجامہ اور اس پر بے تکی سا قمیض، جسکے دامن کارڈیگن کے نیچے ادھر ادھر نکلے ہوئے تھے۔ گلے میں اس نے چوڑا اچکلا مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ آفریں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بے ترتیب سے جھنڈ ایسے بالوں اور گھنی گھنی مونچھوں میں وہ اسے بالکل اجنبی لگا۔ ایک نیا آدمی۔ جس کے سامنے کھڑے ہونے کے خیال سے آفریں کو تھرتھری سی آگئی!۔

"آپ ادھر برآمدے میں چل رہے تھے۔ مجھے آپ کا خیال تک نہ آیا۔ میں یہ سوچ کر ڈر گئی کہ نجانے کون ہے؟" اس نے واہیات سی تاویل پیش کی۔

ہاں، میں روز دیکھ لیتا ہوں" اس نے غیر اہم لہجے میں کہا۔" ملازم نے سب دروازے احتیاط سے بند کیے ہیں کہ نہیں۔ اکثر غیر آباد مقامات پر چوریاں ہو جاتی ہیں!"

آپ ابھی تک سوئے نہیں!۔

نہیں۔ مجھے نیند نہیں آئی!۔

کیوں؟" بے ساختہ آفریں کی زبان سے نکلا۔ نجانے وہ اس سے کیا سننا چاہتی تھی؟۔

وجہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ آفریں!" اسنے کہا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر زینوں کی لگر پر اس طرح رکھ دیا کہ اس کے سائے نے آفریں کو ننھی سی گڑیا کی مانند ڈھک لیا۔

"تم کیوں جاگ رہی ہو؟ ۔ تمہیں نیند کیوں نہ آئی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

میں بھی نہیں جانتی!" ایک موہوم سی سسکی اس کے لبوں پر مچلی پھر اس نے خود کو جلدی سے سنبھال لیا۔" مجھے۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ میں شاید پانی پینے اٹھی تھی!۔"

شاید۔؟؟" وہ آہستہ سے ہنسا اس کی بھاری دلکش آواز آفریں کے دل میں گونج کے رہ گئی۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ پگھلنے لگی موم کی طرح۔ عجیب عجیب سے نامانوس جذبے بڑی تیزی سے اس پر چھانے لگے۔ ایک گہری دھند سی آنکھوں کے آگے جم گئی۔ دل یوں دھک دھک کرنے لگا جیسے پہلیوں

رے تنفس سے اڑ جائے گا۔ اس کی ہتھیلیاں آگ ہو گئیں۔ سارا جسم بھٹی بن گیا!۔

اپنی اس عجیب و غریب گمنام سی کیفیت کو پوری طرح سمجھنے سے وہ قاصر تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور اس طرح اسے سمجھا دے کہ بدن کی پیاس نے اس کے اندر الاؤ سا بھڑکا دیا ہے اس روگ کے آگے شریف سے شریف آدمی بھی سپر انداز ہو جاتا ہے۔

مجھ سے بڑی دور رہنے والے جذبوں نے مجھے بالکل نہتا دیکھ کر مجھ پر پوری طرح حملہ کر دیا ہے۔ جگہ جگہ سے مجھ میں شکست و ریخت جاری ہے۔

"نیزار آگے بڑھیئے۔ بچا لیجئے مجھے!"

وہ ٹکٹکی کھلی آنکھوں سے اسے تکتی رہی جیسے بیداری میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی!۔ نیم وا لب، ہانپتی ہوئی سانسوں کا تند و تیز طوفان۔ وہ خود کو اپنے بیداری کے خواب ہی کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی!۔

نیزار نے شاید اس کی اس کاوشی کیفیت کی اصلی حقیقت سمجھ لی تھی وہ اس کے چہرے پر جھکا! اور اس کے ہونٹوں سے اڑنے والی سگریٹ کی تیز خوشبو نے آفرین کو خواب کی دھندلی وادیوں سے اٹھا کر حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں پر پھینک دیا!۔ اس نے وحشت بھرے انداز سے پلکیں جھپکائیں اور جیسے ہی دفعہ اس کی نگاہیں نیزار پر پڑیں تھیں بھڑکی ہوئی ہرنی کی طرح اس نے کہا، "آپ؟؟"

نیزار نے اسے پانی کا گلاس تھما دیا، "تمہیں پیاس لگی تھی۔ تم پانی پینے اٹھی تھیں۔ آفرین!۔ پانی پی لو۔ اور جا کے سو جاؤ۔ ابھی سویرا بہت

دور ہے !"

ٹھنڈا گلاس اس کی مرتعش انگلیوں میں کانپ رہا تھا۔ اور وہ معدوم سماعت سے کام لے گراں بھاری آہٹوں کو سن رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھیں !۔

دوسرے دن ناشتہ پر توصیف نے اعلان کیا "اب کل تو مجھے قطعی نکل جانا ہے۔ چونکہ بینک میں کام کرتا ہوں۔ مجھے مشکل سے چھٹیاں ملتی ہیں۔ کل اتوار ہے اور پرسوں سے مجھے پھر آفس جانا ہے۔ تم کب تک یہاں ٹھہرو گے ؟"

مجھے تو ابھی دس روز اور مل رہے ہیں !" ضرار نے کہا۔ لیکن اب میں ٹھہر کر کیا کروں گا۔ کل سویرے تمہارے ساتھ ہی نکل چلوں گا !"

میں تو بس سے جانے کی نہیں !" برکہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "چھوٹے چھوٹے راستوں پر ایسا لگتا ہے کہ اب لڑھکی کہ تب لڑھکی !!"

میں بھی بس سے جانے کا نہیں !" اظہار نے برکہ کی نقل میں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے "ضرار بھائی۔ ادھر ادھر کی بھس بھری بوریاں مجھ پر لڑھکتی ہیں اور میری نازم و نازک ہڈیاں سرمہ بن جاتی ہیں !"

آپ خود بھس بھرے بورے !" برکہ خفا ہوئی

بجے رہے ہیں آپ !" اظہار نے فریاد بلند کی۔ آج کل کی لڑکیاں

بزرگوں کا ادب تو رہتیں ہی نہیں سسرالی میں ______!"

ضرار نے جلدی سے ان کا جھگڑا چکا دیا۔ "جب گاڑی موجود ہے تو پھر خواہ مخواہ بس وین کا اینجمنٹ کیا۔ کل سویرے اطمینان سے بائی کار نکل چلیں گے"

"آپ کار مجھے چلانے دیجئے۔ بڑی جلدی سب کو منزل پر پہونچا دوں گا" اظہار دانت نکال کر بولا۔

"ضرور" ضرار مسکرایا "مگر یہاں نہیں۔ جب واپس پہونچ جانا تب جی بھر کے چلا لینا!"

پھر آفریں نے برکہ کے اظہار پر لد پڑنے کا قصہ سنایا۔ ضرار نے اخلاقاً ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ تعجب اور حیرت سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ رات والی آفریں تھی۔ یا کوئی اور۔ اس کی پچھلی رات کی عجیب و غریب مبہم اور سمجھ میں نہ آنے والی کیفیت کیا تھی؟ کیا آفریں کو نیند میں چلنے کی عادت تھی۔ پھر ضرار نے سوچا کہ اس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو آفریں کی خود فراموشی سے کتنا غلط فائدہ اٹھاتا؟۔

اس پر گذشتہ رات کی بدحواسی کا کچھ اثر ہی نہ تھا۔ ہمیشہ کی حسین اور ہمیشہ کی طرح بھولی بھالی نظر آ رہی تھی۔ تب ضرار نے سوچا کہ یقیناً وہ نیند کی حالت میں چلتی پھرتی اور لاشعوری طور پر سارے کام کر جاتی ہے جس کا احساس و ادراک اسے نہیں رہتا۔ ضرار نے بھلا اس سے پہلے ان کے ساتھ راتیں کہاں گزاری تھیں؟۔ وہ کچھ گم صم سا ہو گیا۔ کیا تحسین کو اس بات کا علم نہیں ہے؟۔ انھیں آگاہ کرانا چاہیئے یا

نہیں۔ اگر کبھی آفریں، خواب کی حالت میں کسی کی زبردستی کا شکار ہو گئی۔

تب۔ لیکن نہیں۔ اس نے سوچا۔ پہلے آفریں ہی سے پوچھنا چاہیئے!۔

ضرار بھائی!" عرشیہ کہہ رہی تھی۔" اتنے دن آپ کی وجہ سے بہت اچھے گزرے۔ مجھے تو ہمیشہ یاد رہیں گے۔

ہاں واقعی۔ یادگار رہیں گے یہ دن!" توصیف نے کہا۔" تمھاری وجہ سے بڑا آرام سے بڑی سہولت رہی۔"

مجھے تو تمھارا شکر گزار ہونا چاہیئے بھائی" ضرار نے کہا۔ تم سب کے مل جانے سے اپنے گھر کا سا لطف آگیا۔ ورنہ۔ کیا تھا۔ میں اکیلا کبھی یہاں کبھی وہاں پھرا کرتا اور پھر ہمیشہ کی طرح واپس چلا جاتا۔"

آپ ہمیشہ یہاں آتے ہیں؟" آفریں نے پوچھا۔

نہیں۔ ہمیشہ نہیں۔ بس جب کبھی گھر سے جی گھبرا جاتا ہے۔"

ارے ہاں۔ میں تم سے پوچھنا بھول جاتا ہوں۔ یار یہ کیا معاملہ ہے کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ خدا کا بہت بڑا احسان ہے تم پر۔ اس نے کسی شے کی کمی نہیں رکھی۔ تمھیں تو ابھی تک ایک آدھ بچے کا باپ ہو جانا چاہیئے تھا۔" توصیف نے کہا۔

اب وہ سب ناشتے کے بعد بڑے ہال میں آبیٹھے تھے۔

ضرار نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور مسکرا دیا۔ ہاں۔ شاید۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہو تو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ہوا نہیں۔"

"کوئی لڑکی آپ کو پسند نہیں آئی؟ ضرار بھائی" عرشیہ نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو" توصیف صاحب۔ برا نہ مانیں تو میں ضرور کہوں آج تک تمھاری

ایسی کوئی لڑکی نہیں ملی جو انسان کی فطرت کو پوری طرح سمجھنے کا سلیقہ رکھتی ہو۔" نیزار نے مذاق میں بات ٹال دی۔

"آپ تو بیوقوف بناتے ہیں۔" ترشیہ تنک کر بولی: "ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ میں خود بہتیری تعلیم یافتہ، اونچے گھرانوں کی شریف لڑکیوں کو جانتی ہوں۔ آپ اجازت تو دیجئے تو پھر حیدر آباد واپس چلی چلے ——"

"سنو بہن۔ اسی تذکرے سے گھبرا کر میں حیدر آباد سے بھاگا ہوں۔ یہاں بھی تم وہی تذکرہ چھیڑ رہی ہو۔ اب بھاگ کے کہاں جاؤں؟" وہ ہنسنے لگا۔

"آخر آپ کے اجتناب کی وجہ کیا ہے؟" ترشیہ نے اس کی جان لی۔ "کیسی لڑکی چاہتے ہیں آپ؟"

"معتدل۔" نیزار کے منہ سے نکلا۔

"کیا؟" توصیف نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟" انہار بڑی مستعدی سے بولا۔

"ہاں بتاؤ۔" نیزار نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے ایک ساتھ دو سگریٹ سلگائے۔ ایک توصیف کی طرف بڑھا دیا اور شرارتی نظروں سے انہار کو دیکھنے لگا۔

انہار نے کھانس کر اسٹارٹ لیا: "معتدل لڑکی یعنی موٹی نہ دبلی سی۔ کالی نہ گوری، پڑھی لکھی لیکن لڑنے مرنے میں ایکسپرٹ، ہنس مکھ اور تنک مزاج۔ مطلب یہ کہ ——"

سن رہی ہو۔ عرشیہ۔ اظہار میاں کی پسند۔" ہزار نے قہقہہ لگایا۔" ان کے لئے ایسی ہی صاحبزادی ڈھونڈ دینا۔ دبلی مگر موٹی۔"

میرے لئے تو کچھ اور مقدر ہو چکا ہے صاحب۔" اظہار نے بے بسی سے سر کھجایا۔

خبردار۔ بدتمیز۔" توصیف نے آنکھیں نکالیں۔" تم حد سے بڑھ چکے ہو۔"

لیجئے میں اٹھا ہی جاتا ہوں۔" اظہار کھڑا ہو گیا۔" آج کل ناممکن ہے کہ کوئی سچی بات کہہ کے جان بچا لے جائے!"

نالائق۔ نامعقول۔" توصیف بڑبڑائے۔" ہمیشہ چھیڑا کرتا ہے۔ بے چاری برکہ کو۔"

تو کیا۔ ؟" ہزار نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"کچھ تذکرہ دادی اماں نے کیا تھا کہ برکہ اس لڑکے سے موزوں ہے۔ وہ بات تو آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس نے برکہ کی چڑ مقرر کر لی ہے۔"

"ٹھیک ہی تو ہے۔" ہزار نے سنجیدگی سے کہا۔" میں اس لڑکے کو بہت زیادہ پسند کرنے لگا ہوں۔ میری کوئی بہن ہوتی تو بخدا میں اس سے بیاہ دیتا۔"

کچھ خاندانی الجھنیں ہیں ہزار۔" توصیف نے جواب دیا۔ لڑکیاں اٹھ کر چلی دیں۔ اور توصیف اس سے خاندانی باتیں کرنے لگے۔ کوئی بات چھپائی نہیں۔ ہزار سنتا رہا اور متاسفانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ پھر بولا۔

"تمہاری شادی کے روز دادی اماں نے تھوڑی بہت تفصیل سنائی تھی۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ تمہاری چچی جان کی ٹریجڈی سن کر بڑا افسوس ہوا۔ دیکھو۔ توصیف۔ دل کے کھیل عجیب ہیں۔ بے چاری نجانے کس طرح بے قرار رہتی ہیں اپنی لڑکی کی جدائی میں۔ کیا الطاف احمد صاحب برکہ کا ان کے پاس رہنا پسند نہیں کرتے؟ اس میں حرج کیا ہے"

"تم نے چچا جان کو نہیں دیکھا۔ ضرار۔ بڑے غصہ ور، عجیب مرنجان مرنج واقع ہوئے ہیں۔ جبھی جب انھوں نے بیوی کو طلاق دے دی تو اس سے مزید کیا واسطہ رہا۔ لیکن وہ تو بیجر صاحب کو ابھی تک۔ اپنا بدترین رقیب سمجھتے ہیں، اور غالباً انہی کی وجہ سے برکہ کا ان کے پاس قیام پسند نہیں کرتے!"

"ان حالات میں بھلا وہ اخبار سے برکہ کا وابستہ ہونا کہاں گوارہ کریں گے؟"

قطعی نہیں!"

"الطاف صاحب کے اور بچے تو ہوں گے؟"

"ہاں۔ غالباً دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں!"

"برکہ تو بہت پیاری بچی ہے"

بہت!۔ بہت چھوٹی سی تھی۔ جب ہمارے پاس رہنے آئی تھی!"

اور ظاہر، بے چارہ ایک ہی ہے"

"ہاں" توصیف نے کہا" باپ کی آنکھ کا تارہ ہے۔ چچی جان بھی بہت چاہتی ہیں!"

چاہے جانے کے قابل ہے۔"

فرار! تم کتنے بہن بھائی ہو؟۔

اکیلا ہوں بھائی۔ پچیس چھبیس برس پہلے ماں کا انتقال ہوگیا۔ میں شاید اس وقت پانچ چھ سال کا تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے اپنی مرحوم والدہ کی شکل و صورت بھی اچھی طرح یاد نہیں۔ اب بے چارے ڈیڈی ہیں میرے۔ اور کوئی نہیں۔ ویسے سنا ہے کہ خاندان بہت بڑا ہے۔ لیکن کسی زمانے میں جب ڈیڈی افلاس و تنگدستی کے دور سے گزر رہے تھے۔ ان کی مدد کسی نے نہیں کی۔ ڈیڈی کہتے ہیں کہ میرے اسکول کی تین ماہ کی فیس وہ ادا نہ کرسکے تھے۔ شاید چھ روپوں کے لئے ڈیڈی میرے چچا اور ماموں کے سامنے گڑگڑائے تھے۔ لیکن میری فیس نہ مل سکی۔ اسکول سے میرا نام کاٹ دیا گیا۔ ڈیڈی نے بھی بہت بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر ان کا یہ دور گزر گیا۔ ان کے حالات بدل گئے، تب بھی وہ کسی سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ اور ابھی تک انھوں نے اپنی قسموں کو اچھی طرح نبایا ہے۔ چنانچہ میں نہیں جانتا تو صیف میرا خاندان اگر ہے تو کہاں ہے۔ میرے دوسرے رشتے دار کتنے ہیں۔ ڈیڈی کسی سے میرا ملنا جلنا قطعی پسند نہیں کرتے۔ اور میں ڈیڈی کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا۔ بس یہ ہے سارا قصہ!"

تو تم بے چارے ڈیڈی کو تنہا چھوڑ آئے ہو؟"

انھوں نے خود ہی اجازت دی تھی!"

کچھ بھی ہو۔ فرار۔ اب تم شادی کرو۔ اور اپنی اور ان کی تنہائی کا مداوا تلاش کرو!"

ہاں۔ ہونا تو چاہیئے!" شہزاد نے رسمی طور پر کہا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ سب دیر تک بڑے کمرے میں بیٹھے مختلف باتیں کرتے رہے۔ چونکہ انہیں یہ احساس افسردہ کر رہا تھا کہ کل یہ دلچسپ دن بکھر جائیں گے!۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ تخ اور گرم کافی کے ایک دور کے بعد توصیف اور عرشیہ سونے چلے گئے۔ ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد اظہار بھی چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہونچکر توصیف نے عرشیہ سے کہا: "عرشیہ! میری تو سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہے کہ میں شہزاد صاحب کی اتنی بے پایاں عنایتوں اور نوازشوں کا کیا بدلہ دوں گا!"

"وہ کوئی بدلہ چاہتے کہاں ہیں۔ برا نہ مان جائیں گے؟" عرشیہ بولی۔

"پھر بھی!۔ سوچو کچھ کہ۔ کم از کم میرے ضمیر پر رکھا ہوا بوجھ تو کسی صورت ہلکا ہو سکے!" توصیف نے بڑی تشویش سے کہا۔

عرشیہ کو سوچنے میں کچھ دیر نہ لگی۔ فوراً بولی: "تو پھر کسی بہانے اپنی یہ یاقوت کی انگوٹھی اتار کے انہیں پہنا دیجئے۔ کہ۔ ان دنوں کی یادگار آپ کی نشانی اپنے پاس رکھیں!"

"بیری یار۔ ونڈرفل" توصیف نے خوش ہو کر کہا: "یار۔ کالے ریشم کے اس ڈھیر کے نیچے کافی مال مصالحہ معلوم ہوتا ہے۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا کہ۔ اس چھت کے نیچے کرایہ کے لئے کمرہ خالی ہے"

عرشیہ کو بے تحاشہ ہنسی آئی!۔ توصیف مسرور تھے کہ ان کی بیوی خاصی فراخ دل ثابت ہوئی ہے۔

اندر کہیں دالان کی بڑی دیوار گیر گھڑی نے گھن گرج سے گیارہ بجنے کا اعلان کیا۔ اور لمبی لمبی جماہیاں لیتی ہوئی برکہ نے بھی فنراد سے اجازت چاہی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے برآمدے میں اچانک کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا اگر فوراً ہی اظہار کی آواز اس نے سن نہ لی ہوتی تو بری طرح چیخ اٹھتی۔

یہ کیا حرکت ہے" اس نے پھولی پھولی سانسوں میں کہا" چھوڑئیے مجھے نیند آرہی ہے"

سنو برکہ سنو" اظہار گھگھیایا" بس دس بارہ گھنٹوں بعد ہم میں پھر جدائی ہو جائے گی"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

برکہ، کبھی تم نے سوچا کہ میرا انجام کیا ہوگا؟ تم شاید یہ سمجھتی ہو کہ میں اپنے جذبات میں سچا نہیں ہوں۔ میں ہر وقت ہنسی مذاق میں وقت خراب کرتا رہتا ہوں۔ میں سنجیدگی سے کچھ نہیں سوچتا۔ لیکن برکہ۔ تم یقین کرو، بہت سی فکروں نے مجھ پر اتنی یلغار کی ہے کہ میں ساری ساری رات سو نہیں سکتا۔ یہ خلش مجھے بے چین رکھتی ہے کہ اگر تم مجھے نہ ملیں تو پھر میں کیا کروں گا؟"

"بڑا وقت رہ گیا ہے فرزدل کی ان باتوں کا!" برکہ نے اپنا بازو چھڑایا اور بھن بھنا کر بولی۔

اظہار معنی ان سنی کر کے بولا" تم نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ کم سے کم یہی ایک بہانہ ہوتا کہ تم آگے پڑھنا چاہتی ہو۔ اب تو تمہارے ڈیڈی کوئی تاویل بھی نہ سنیں گے۔ اگر انھوں نے تمہارا کوئی رشتہ تلاش کر لیا تو پھر کیا ہوگا؟۔ وہ تو کسی کی ایک نہیں سنتے!۔ اور پھر میری تو صورت

ہی سے انھیں نفرت ہے۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ وہ میرے ہاتھ میں نہیں دے سکتے!

برکہ چپ رہی!۔

برکہ؟!

جی!" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

مجھے تو ابھی تک تمھارے محسوسات کا اندازہ نہیں"، اظہار نے کہا وہ بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا: "تم بھی میرا دائمی ساتھ پسند کرتی ہو کہ ۔ یہ دلیرانگی میری اپنی ہے۔ کہو برکہ: تم کیا سوچتی ہو۔ اگر تمھیں میری رفاقت پسند نہیں ہے۔ تم نے کچھ اور سوچ رکھا ہے تو پھر میں چپ چاپ تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔"

میرے اختیار میں کیا ہے؟" برکہ بولی۔

تم اپنے اختیار میں تو ہو۔ مجھے یہ اطمینان دلادو کہ میری محبت میں تمھارے اعتماد کا بھرم بھی شامل ہے تو پھر دنیا کی ہر تلخی میں شیرینی سمجھ کر گوارہ کر لوں گا!"

مجھے نہیں آتیں فضول باتیں"، وہ جھلائی اور شرارت سے مسکرا دی۔"

"اچھا میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ!"

آج آپ نے ضرور بھنگ پی ہے۔

محبت کا نشہ دنیا کے ہر نشے سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ خیر تم بھنگ ونگ کو چھوڑو ہو چھیڑو میں۔ میری بات کا جواب دو! پھر موقع نہیں ملے گا۔ برکہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ یقین کرو میں اپنی تعلیم کا حرج کرکے

اسی لئے تو یہاں بھاگا آیا ہوں کہ تمھارا ساتھ رہے گا۔ ورنہ کچھ میرا اپنا ہوں تو تھا نہیں!!"

میں اپنے اختیار میں ہوں بس! - بار کے ایک بار ت کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جاتے ہیں!" ہر کہ نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

زندگی بڑھادی تم نے۔ اب تو میرا جی چاہنے لگا ہے کہ تمھیں اپنے سینے سے لگا کر خوب سے پیار ———— !"

"لو۔ ہو گئی نا پیار دیار کی بدماشی!" ہر کہ نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ اور رات کے کاجل میں گھل مل گئی۔

اظہار ہنستا ہوا چلا گیا۔

بڑے کمرے میں ہیٹر آن تھا۔ فضا گرم تھی۔ دریچے کے باہر پھوار پڑنے کی آواز سنسنی خیز سی لگ رہی تھی۔ کبھی کوئی بوند ٹپ سے درخت پر پڑتی اور یکبارگی رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ضرار نے بجھتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سلگایا۔ اور بچا ہوا ٹکڑا ایش ٹرے میں ڈالتا ہوا آفریں کی طرف دیکھنے لگا!۔

اس کی کالی کالی آنکھوں میں ہلکی ہلکی گلابیاں تیر رہی تھیں۔ رات کا سارا فسوں ان آنکھوں میں سما گیا تھا!۔ شفاف پیشانی پر ایک دو نوٹی موٹی لٹیں جھوم رہی تھیں۔ خوش نما لب کھنچ گئے تھے! وہ ہمیشہ سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی!!۔

ضرار اس سے کچھ پوچھنے کچھ کہنے کے مناسب پیرائے ڈھونڈ رہا تھا اور بے خیالی میں تیز کش لے رہا تھا!۔ پوری فضا اس نے دھواں دھار

کر رہی تھی۔ وہ اپنی بےچینی چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تبھی آفریں بولی۔

"اللہ۔ آپ کتنی بہت سگریٹیں پیتے ہیں! سنا نہیں آپ نے سگریٹوں کا بھی زہر ہوتا ہے۔"

جس کی ساری زندگی زہر میں بجھی ہو۔ اس پر دوسرا زہر اثر نہیں کرتا۔ ضرار نے جواب دیا۔

"کچھ بھی ہو۔ اب میں نہیں پینے دوں گی۔" آفریں بولی۔ پھر ضرار کے ہاتھ کے نیچے سے سگریٹ کیس کھینچ لیا۔ اور ہنسنے لگی!۔

ضرار نے محسوس کیا تھا کہ وہ جان بوجھ کر چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرتی تھی۔ نجانے کیا سوچتی تھی۔ اس نے کبھی ضرار کا نام لے کر اسے مخاطب نہیں کیا تھا!۔ اور یہ ذرا سی باتیں ضرار کے لئے ایک جہانِ نو تعمیر کر رہی تھیں۔ لیکن وہ اتنا خوددار، آن پرست اور اصول پسند انسان تھا کہ اپنے تاثر کو ظاہر کر کے اپنے آپ کو سبک و خفیف کرنا اسے کسی صورت میں گوارہ نہ تھا۔ اگر آفریں اپنے سلوک میں سنجیدہ نہ ہو۔ تو خواہ مخواہ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا!۔

اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور ظاہر نہیں کیا کہ آفریں کی یہ بات اسے بڑی اچھی لگی تھی!۔

وہ تو شروع سے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کر رہا تھا!۔

آفریں اس کا سگریٹ کیس میز پر بجانے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ نے مجھے کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا!۔ دے دیجئے۔ کل سویرے

ہی تو نکل چلنا ہے۔ پھر کہاں موقعہ ملے گا؟"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ اپنی پسندیدہ کتابیں تم نے الماری سے نکال لی ہیں۔"

"آپ کی اجازت کے بغیر کیسے نکال لیتی۔"

"تمھیں اجازت کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے آفریں۔"

"سچ مچ؟"

"ہاں۔"

"کتابوں کے معاملہ میں آپ کا دل بہت بڑا ہے۔"

"میرے دل کا معاملہ ابھی تم پر کھلا نہیں۔ وہ ویسے بھی ہر بات میں بہت بڑا ہے۔"

"اگر میں آپ کی چیزیں آپ سے لے کے واپس نہ کردوں تو؟"

"تو کیا ـــــ؟"

"لے جاؤں بہت ساری چیزیں!" وہ شوخی سے ہنسی۔

"بہت قیمتی سمجھتی ہو ان چیزوں کو آفریں! جو کچھ تمہارا جی چاہے لے جاؤ اور واپس مت کرو!"

"نہیں نہیں۔ میں تو مذاق کررہی تھی۔ آپ سچ سمجھے! بس مجھے دو چار کتابیں دے دیجئے۔ یونیورسٹی میں آپ ملیں گے نا۔ واپس کردوں گی۔"

"اچھا۔" وہ اداس ہو گیا۔

"دس ہی روز تو رہ گئے ہیں یونیورسٹی کے کھلنے میں۔"

"ہاں!"

"گیارہ بج چکے ہیں۔ آپ بھی آرام کیجئے۔ میں بھی سوتی ہوں۔" وہ

اٹھنے لگی۔

"ٹھہرو۔ آفریں!"

وہ پھر بیٹھ گئی اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے۔ پوچھنا تو نہیں چاہیئے۔ لیکن۔" وہ رک گیا۔

"پوچھئے نا!"

"آفریں۔ تم برا مت ماننا۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ۔ تم۔ بیداری کے خواب کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"بیداری کے خواب؟" آفریں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ یہ شاید کوئی نفسیاتی مرض ہے۔ میں بھی اچھی طرح نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ بعض آدمی نیند کی حالت میں چلتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے سارے کام انجام دیتے ہیں۔ جیسے وہ جاگتے میں انجام دیتے۔ لیکن حقیقت میں جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو انہیں کچھ یاد نہیں ہوتا!"

"جی ہاں۔ سنا تو میں نے بھی ہے۔ کہ ۔۔۔ کا مرض کہتے ہیں اسے!"

"آفریں؟؟"

"جی!!" اس کا بھولا بھالا چہرہ زیادہ دلفریب دکھائی دینے لگا۔

"اب میں پوچھوں کوئی بات!!"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ نجانے آپ کیا پوچھیں گے!!"

"آفریں۔ پرسوں رات کو۔ بارہ بجے کے قریب۔ جب تم"

"ارے ہاں۔ وہ۔!!" آفریں یک بیک اچھل سی پڑی۔ اسکی آنکھوں سے دفعتاً خوف وہراس جھانکنے لگا۔ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی:

"جی ہاں۔ پرسوں۔ پرسوں رات!" پھر وہ ضرار کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چند ساعتوں تک آفریں اس کے سنجیدہ چہرے پر نظریں جمائے رہی۔ پھر پلکیں جھکا لیں۔

"کیا ہوا اس رات؟ مجھے بتاؤ آفریں!" ضرار نے کہا۔

"ہوش ہی گم ہو گئے تھے!" دونوں ہاتھ ضرار کے سامنے پھیلا کر گردن خم کر کے اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس نے اس طرح کہا کہ ضرار ہی کے ہوش و حواس پر بجلیاں سی گرا دیں۔

"آپ سب سو گئے تھے نا!" اس نے بڑی سادگی سے بتایا: "بھائی جان بھی سو گئے، عرشیہ بھی سو گئی۔ اظہار بھائی بھی سو گئے۔ اور برکہ بھی سو گئی۔ اور ـــــ"

ضرار کو ہنسی آگئی: "ہاں۔ سب سو گئے۔ آگے بھی تو کہو!"

"آپ نہیں سوئے تھے!" اس نے فوراً تائید کی: "لیکن میں سمجھی کہ آپ بھی سو گئے ہیں!"

"اچھا۔ تو پھر کیا ہوا؟"

"اندھیرا اتنا تھا۔ سناٹا تھا۔" آفریں نے باقاعدہ منظر کشی کر کے بتایا "مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بستر پر پڑی چھت کو تک رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ میں بھی تو ادھر ادھر گھوم پھر کے اتنی تھک چکی ہوں۔ مجھے سو جانا چاہیے۔ لیکن نیند تو نہیں آئی اور نجانے کیسے کیسے خیالوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وحشت کے مارے میرا گلا سوکھ گیا تھا۔ مجھے اتنی پیاس لگی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں

سے پانی نہیں پیا ہے!"

"کیسے خیال تھے۔ جنہوں نے تمہیں پریشان کیا؟"

"پتہ نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔ "میں منہ سے نہیں نکال سکتی!"

فرزاد کی سانسیں تیز ہو گئیں! ہوس دنفس کے بھیانک دیو دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ دفعتاً اس نے اپنے بھڑکتے ہوئے جسم پر سے پلیا اور اُتار پھینکا! اور آگ کی طرح جلتی ہوئی ہتھیلیاں میز کی ٹھنڈی سطح سے چپکا دیں! اس کی آنکھوں میں تاریکی چھانے لگی!

"پھر جب میں گھبرا کے کمرے سے باہر نکلی تو آپ مل گئے۔" آفریں بول رہی تھی۔ اس نے فرزاد کی طرف دیکھ کر اطمینان کی طویل سانس لی۔ "اللہ مجھے تب ایسا لگا۔ جیسے میں ٹھنڈے پانی کے چشمے کے پاس آگئی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر ساری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ مگر آپ کے نزدیک پہنچ کر دیسے سے ہوش بھی کھو گئے۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ۔ بیداری کے خواب۔ بھی۔ اپنی کوئی حقیقت رکھتے ہیں۔ میں۔ شاید۔ آپ کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ آپ میرے پاس ہیں۔ اور۔ اور۔ آپ ابھی آگے بڑھیں گے پھر۔ پھر ـــــ اُف۔ یہ بیداری کے خواب۔ میرے اللہ۔ سچ بتائیے! کیا وہ۔ میرا خواب تھا۔ لیکن نہیں۔ آپ ہی نے تو پانی کا گلاس مجھے تھما دیا تھا۔"

ضبط و احتیاط کی مضبوط باگیں فرزاد کے ہاتھوں سے نکلنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا!

آفریں بھی کھڑی ہو گئی۔ اب تنہا خالی تپائی درمیان سے فرزاد و دامن

طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس کے آر پار دیکھنا چاہتی ہو۔
فرزاد نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔
آفریں کو ہوش آگیا۔ اس نے ایک سسکی سی لے کر فرزاد کے بازو پر سر رکھ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
"آپ تو میرے اپنے تھے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو کیا ہوتا" اور اس کے گرم گرم آنسو فرزاد کے ہاتھ پر گرے۔
اسے ایسا لگا جیسے اس کا تپتا ہوا جسم دفعتاً سرد ہو گیا ہو!۔
وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کچلنے لگا! بھرائی ہوئی سی غیر انسانی آواز اس کے لبوں سے نکلی۔
"جاؤ۔ آفریں۔ اب تم جاؤ"
پھر اس نے ایک بے جان بوجھ کی طرح خود کو کرسی میں گرا دیا اور کسی ظالم جذبے سے مجبور ہو کر آہستہ آہستہ رونے لگا!۔

پھر اسی پگڈنڈی پر ان کی کار واپس جا رہی تھی!۔
فرزاد گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے پاس توصیف اور اظہار تھے۔ پچھلی نشست پر آفریں، عرشیہ اور برکہ تھیں۔
برکہ بے حد خوف زدہ تھی، اظہار اسے ڈرا رہا تھا۔
"وہ سامنے بادل دیکھ رہی ہو۔ اب کار انہی میں سے ہو کر آگے بڑھے،

ذریعہ عزار نے اپنے ڈیڈی تک اپنی اور سب کی آمد کی خبر پہونچائی۔

عرشیہ حیرت سے کوٹھی کی وسعت و آرائش دیکھ رہی تھی۔ بولی: "اتنے بڑے گھر کے لئے بہت سے مکیں ہونے چاہئیں۔ کیوں عزار بھائی؟"

"جتنے مکیں تھے وہ اپنی ابدی کوٹھیوں میں پہونچ گئے بہن!" وہ بولا۔

ملازم نے اطلاع دی: "بڑے سرکار دالان میں ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں!"

طویل و عریض دالان تیز روشنی میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہاں کی ویرانی دل پر عجیب سا سوگوار اثر کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی تفریحی مسرتیں بے نام سی افسردگی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں!

تخت کے پاس انھوں نے بڑی سی پہیوں دار کرسی پر ایک منحنی سے معمر آدمی کو بیٹھے دیکھا۔

عزار نے ان سے سب کا تعارف کرایا۔

توصیف نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ بڑے میاں بس مُشتِ استخواں ہی تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ دھندلی زرد زرد جالا پڑی آنکھیں حلقوں میں ہل رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے پیوستہ باریک لب۔ شکنیں پڑی سفید رنگت، سفید بال، مرتعش ہاتھ پاؤں۔ عمر یقیناً ان کی پچھتر برس سے کم نہ تھی۔ بعض بوڑھے اس عمر میں بھی خاصے تنومند ہوتے ہیں۔ مگر یہ بے چارے تو بس موہوم سے ہو رہے تھے۔ وہ جب بولے تو پتہ چلا کہ ان کی زبان بھی ان کے قابو میں نہ تھی!۔

"بیٹھو بیٹھو۔ تم سب بیٹھو۔ بچو!" انھوں نے طفلانہ خوشی کا مظاہرہ کیا

بہت مسرت ہوئی۔ تم سے مل کے۔ بہت مسرت ہوئی۔"
توصیف کی نظریں ان کی ٹانگوں پر پڑیں۔ جن پر سرمئی رنگ کا گرم کمبل ڈھکا ہوا تھا۔ ان کی پہیوں دار چرمی کرسی بھی ان کی کسی معذوری کی دلیل تھی۔ وہ گم صم سے ادھر ادھر تک گئے۔
یہ سب۔ یہ سب تمہارے ساتھ۔ پڑھتے ہیں۔ بیٹا!" انھوں نے نزار سے پوچھا۔ جو اپنے مہمانوں کی خاطر خواہ ضیافت کے انتظام میں ادھر ادھر پھر رہا تھا۔
جی ڈیڈ جی۔ یہ میرے دوست ہیں!" اس نے روا روی میں جواب دیا۔ اور غالباً خانساماں کو ہدایت دینے کے لئے تیز تیز قدموں سے کچن کی طرف چلا گیا۔
"آٹھ۔ آٹھ دس سال سے۔ معذور ہوں!" بڑے میاں کہہ رہے تھے "تقریباً۔ سارا جسم۔ پورا بدن۔ مفلوج ہو گیا تھا۔ مفلوج ہو گیا تھا پورا بدن۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ زبان۔ زبان پر بھی۔ اثر ہو گیا تھا۔ کافی۔ کافی علاج کیا گیا۔ میرا بیٹا۔ مجھے۔ ہوائی۔ ہوائی جہاز میں ادھر ادھر لئے لئے پھرا۔ خدا خدا کر کے۔ اتنا ہوا کہ۔ بولنے لگا۔ دیکھنے لگا۔ مگر۔ ٹانگیں۔ ٹانگیں۔ اچھی نہ ہو سکیں۔ یہ دیکھو۔ گھٹنوں سے نیچے۔ چوب خشک۔ مطلب یہ کہ سوکھی لکڑیوں کی طرح بیجان ہو گئیں!"...
انھوں نے گھٹنوں پر سے کمبل سرکایا۔ دیکھنے والوں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ گھٹنوں میں گویا کھپچیاں سی لگی تھیں!۔

"ضرار نے ہم سے کہا نہیں تھا جناب" توصیف بولے اور کمبل اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے پھر ان کے زانوؤں پر ڈال دیا۔

"جناب نہیں۔ ڈیڈی۔ ڈیڈی کہو مجھے۔ جیسے میرا بیٹا کہتا ہے"

وہ اس طرح مسکرائے کہ ان کی بے چارگی پر انھیں ترس آ گیا۔

"تم اس کے دوست، دوست ہو" انھوں نے کانپتا ہوا ہاتھ انکی طرف اٹھائے "میرے اپنے۔ میرے اپنے بچے ہو۔ ڈیڈی کہو مجھے۔"

"بڑا افسوس ہوا آپ کی اس مجبوری پر" توصیف بولے۔

"اسے۔ ایسے نہیں ہوتا افسوس" بڑے میاں کا لہجہ بچہ کا سا ہو گیا "وہ مجھے۔ اب بھی۔ اب بھی نادان سمجھتا ہے۔ میری عمر بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی ہے" وہ ہنسے "وہ۔ اڑتا ہے مجھ سے۔ میری کوئی بات نہیں مانتا۔ نہیں مانتا میری کوئی بات۔ کہتا ہے کہ۔ ڈیڈی آپ کو پریشانی کیا ہے؟ مزے میں۔ کرسی پر لیٹ جایئے۔ اور اچھی اچھی کتابیں پڑھئے بھلا بتاؤ تو بیٹے۔ کہاں تک میں کتابیں پڑھوں گا! کیا میرا دل نہیں چاہتا۔ اس کی دلہن میرے گھر میں چلے پھرے۔ میرے مرنے سے پہلے اپنا ایک آدھ پوتا گودی میں کھلاؤں۔ آہ۔ یہ تمنا میرے بڑھاپے کی شاید تمنا ہی رہ جائے گی۔"

"واقعی ضرار آپ کا کہا نہ مان کر آپ پر ظلم کرتے ہیں" توصیف نے کہا۔ ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں۔ کسی کو اطمینان نہیں۔ بہت کم ایسے لوگ جن کی تمنائیں ان کی زندگی میں بر آور ہوتی ہیں۔ ویسے سبھی سر اٹھا کے چلتے رہتے ہیں۔ بے حد عیار جاننے

ہیں۔

ان بڑے میاں کے پاس دولت و ثروت کی کمی نہیں۔ لیکن وہ دولت سے دل کا چین نہیں خرید سکتے!۔

"میری۔ ایک منہ بولی چھوٹی بہن ہیں!" بڑے میاں بولے "ان کی۔ نواسی ہے۔ بہت اچھی بچی ہے۔ میں اسے پسند بھی کرتا ہوں۔ شزار کے لئے وہ نہایت موزوں ہے۔ پیپ۔ پڑھی لکھی۔ سلیقہ شعار۔ کم عمر، حیاپرور!۔ شزار سے لاکھ لاکھ بار خوشامدیں کیں۔ یہ تک کہا کہ میں بس صبح کا چراغ ہوں۔ موت کا ایک جھکڑ مجھے قبر میں ڈھکیل دے گا۔ میری بس یہ آرزو پوری کر دے۔ "آسیہ کو میری بہو بنا دے:۔ لیکن۔ نہیں۔ وہ۔ مجھ سے لڑ جھگڑ کر۔ چلا گیا!"

ان کی آواز رندھ گئی۔

"اب ہم انھیں مجبور کریں گے ڈیڈی کہ وہ آپ کا حکم مان لیں" عرشیہ نے کہا۔ "انھوں نے مجھے بھی اپنی منہ بولی بہن بنایا ہے۔ میری بات ضرور مان لیں گے!"

"خدا کرے بیٹی۔ خدا کرے!" وہ خوش ہو کر بولے۔ پھر اپنی کانپتی ہوئی انگلی ہونٹوں پر رکھ لی "چپ رہو۔ چپ رہو۔ شاید وہ آ رہا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد پھر مجھ سے لڑے گا کہ میں نے یہ سب تم سے کیوں کہا تھا۔ چپ رہو۔ میری کوئی بات اس سے مت دہراؤ!"

قدموں کی چاپ نزدیک آ گئی!۔ ایک بار پھر بڑے میاں نے انھیں تادیبی نظروں سے دیکھا!۔

شزار آیا اور باپ کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ انھوں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھا لیں۔

ڈیڈی۔ ان سب کو اجازت دیجئے!" اس نے بے حد پیار بھرے نرم لہجے میں کہا۔ "کھانے کی میز تیار ہے۔ انھیں اپنے گھر بھی تو پہنچنا ہے نا ڈیڈی!"

"اچھا اچھا!" انھوں نے سر ہلایا۔ "جاؤ۔ کھانا کھالو۔ مگر میرا دل نہیں چاہتا۔ یہ بچے۔ یہاں سے جائیں۔ گھر کتنا بھرا بھرا لگ رہا ہے۔ میں تو آدمیوں کی صورت کو ترس گیا ہوں۔ کوئی دوست نہیں ہے میرا۔ کوئی نہیں آتا میرے پاس۔ تم چلے جاتے ہو۔ میں اکیلا۔ بدروح کی طرح سارے گھر میں کرسی گھماتا پھرتا ہوں۔ کہیں جی نہیں لگتا!"

"او۔ ڈیڈی۔ ایسی باتیں مت کیجئے۔ مجھے ابھی بہت سی چھٹیاں ہیں۔ بس میں آپ ہی کے پاس بیٹھا رہوں گا۔ ڈیڈی۔ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا!" ضرار نے کہا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے بچے کو چمکار رہا ہو۔

پھر وہ ان سب کو ڈائیننگ روم میں لے گیا۔ مجلی کمرہ۔ شیشے اور کانچ کے قیمتی ظروف اونچی اونچی الماریاں۔ چمکتے ہوئے پیتل کے بھاری بھرکم گلدان۔ اور نجانے کیا کچھ دیکھ کر ان سب کو بے حد حیرت ہوئی۔ لمبی سی میز پر کئی ایک قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔

"ذرا بھی اشتہا نہیں ہے ضرار!" توصیف نے کہا۔ "تمھاری خاطر میز پر بیٹھ جائیں گے لیکن سچ تو یہ ہے کہ تمھارے والد صاحب کو دیکھ کر ان کی باتیں سن کر ساری بھوک پیاس کافور ہو چکی ہے۔ تم نے اتنے دنوں میں ایک دفعہ بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا!"

"کیا کرتا تذکرہ کر کے میرے دوست۔ جو بوجھ میرے سینے پر رکھا ہے میں اسے تمھارے سینے پر کیسے لاد دیتا!" ضرار کا لہجہ بوجھل ہو رہا تھا۔ "تم تو

بنی مون منانے گئے تھے۔ شہر سے دور۔ سکون کی تلاش میں۔ میں ایک غمناک تذکرہ چھیڑ کر تمھارے عیش افزا لمحات کو برباد کیسے کر دیتا؟۔

ان کی باتیں سن کر مجھے تو رونا آگیا ضرار بھائی۔ آپ ان کا کہا کیوں نہیں کر دیتے؟" عرشیہ بولی: "بے چارے سچ مچ بہت قابل رحم ہیں۔ کیا آپ کو ان پر ترس نہیں آتا؟"

ان کی خاطر میں مر بھی سکتا ہوں۔ عرشیہ۔ مجھے اگر پتہ چلے کہ میری عمر لینے سے ان کی عمر اتنی ہی اور بڑھ جائے گی تو میں اپنی عمر انھیں دے دوں۔ لیکن میں خود پر کیسے ظلم کر سکتا ہوں؟"

کیا مطلب؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ان کی بہو کی حیثیت سے کسی ایسی لڑکی کو خود پر کیسے مسلط کر لوں جسے میں جانتا پہچانتا نہیں!"

انھوں نے اپنی منہ بولی بہن کی لڑکی کا تذکرہ کیا تھا" عرشیہ نے کہا۔

ہاں وہ پتہ نہیں کن کن لڑکیوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں" ضرار نے کہا مگر دفعتاً اس کا چہرہ کاغذ کا سا سفید ہو گیا تھا۔

بہر حال۔ شروع کیجیے آپ لوگ" اس نے جلدی سے کہا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

تمھیں اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے مگر ــــ!" توصیف نے کہا۔

ان کی بات ضرار نے کاٹ دی۔

دولت ایک بیماری ہے۔ توصیف کسی بیماری کا علاج نہیں ہے" آفریں اس کی اس بات پر بھڑک اٹھی۔

کھانا کسی سے کھایا نہ گیا. پھر سب اٹھ کر دالان ہی میں آ گئے. مغرب کا دھندلکا در و بام پر اترنے لگا تھا. خشک ہوائیں، آہیں بھر رہی تھیں. ملازموں نے یہاں وہاں پوشیدہ مرکیوری راڈز آن کر دیے اور کوٹھی کی سنسانی میں زیادہ ترقی ہو گئی.

مزار کے والد سے مل کر یہ لوگ دل پر غموں کا بوجھ لیے مزار سے بھی رخصت ہوئے!.

اپنے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی انھیں کسی غیر مستحق ولی صورت حال کا احساس ہوا. کچھ تناؤ کی سی فضا.

عرشیہ کی حیثیت دلہن کی سی تھی. لہٰذا وہ سر ڈھانپ کر جلدی سے دالان میں ہو رہی!. توصیف نے دیکھا کہ ڈاکٹر الطاف احمد سامنے دالان میں بیٹھے تھے اور ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر غصے کے آثار تھے!.

آداب عرض چچا جان!" توصیف نے کہا.

آداب عرض بھئی!" انھوں نے کچھ چیں بجبیں ہو کر کہا." یہ تمھیں کیا سوجھی تھی کہ تم برکہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے!.

ارے چچا جان یہ بے چاری بچیاں بھلا گھر سے باہر ہی کب نکلتی ہیں. میں نے سوچا کہ اسی بہانے کم از کم ہفتہ بھر کے لیے تو انکی آب و ہوا بدلے" توصیف ہنسے" آپ کب تشریف لائے؟"

دادی اماں بدستور اپنے بڑے تخت پر متمکن تھیں. ان کے سامنے بڑا سا لکھنوی پاندان کھلا رکھا تھا. وہ اتنے غیظ و غضب کے ساتھ چھالیہ کاٹ رہی تھیں جیسے دشمنوں کے سر کاٹ رہی ہوں.

برکہ خاموشی سے دادی کے پہلو میں جا بیٹھی۔
آفریں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔
"اماں بی۔ کیا فرماتی ہیں آپ" دفعتاً ڈاکٹر صاحب کی آواز دالان میں ابھری "میں لے جاؤں برکہ کو اپنے ساتھ؟"
"اپنے ساتھ" برکہ زیرِ لب بولی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
"میں کچھ نہیں جانتی" دادی اماں نے کہا اور منہ پھیر لیا۔
"عجیب تماشہ ہے صاحب" ڈاکٹر صاحب نے کہا "اپنی لڑکی کو بھی میں کہیں لانے لے جانے کا حق نہیں رکھتا؟"
"میرا منہ نہ کھلوانا۔ الطاف" دادی بی بھڑک اٹھیں "بڑا آیا ہے اپنی لڑکی پر حق جتانے۔ بالشت بھر کی ننھی سی جان کو میری چھاتی پر پھینک گیا تھا تب اس کا حق بھلا دیا۔ اچھا برا دکھ سکھ سب ہم نے بھوگا۔ خود عیش کرتا رہا غیر کنبہ جڑوا کے ساتھ۔ آج جب اس کی خدمت کا سوال آ پڑا ہے تو لڑکی یاد آئی ہے۔ سن لے کان کھول کے۔ میری پوتی ایسی گری پڑی نہیں ہے کہ تیری میری خدمت کرتی پھرے۔"
"بھائی صاحب آپ سن رہے ہیں" الطاف صاحب نے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔
"اماں بی۔ اگر چند روز کے لئے یہ برکہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس میں حرج کیا ہے" اوصاف صاحب نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا تھا مگر دادی اماں نے جل کر ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"نہ بھائی صاحب نہ بھائی صاحب کے باپ۔ کوئی میرے آگے چوں نہیں کرسکتا۔ بس۔ لے جا اپنی صورت یہاں سے۔ بر کہ کو میں تیرے ساتھ نہیں بھیجوں گی!"

اماں بی۔ سوچ لیجئے۔ یہ بہت برا کر رہی ہیں آپ۔ مجھے غصہ دلا کر آپ بہت پچھتائیں گی" الطاف صاحب نے کہا۔

اور پھر جیسے بارود کے قلعہ میں کسی نے آگ لگادی۔ دادی اماں اپنی نازک سی تولہ بھر کی جوتی سنبھال کر اٹھیں۔

"میں پچھتاؤں گی" وہ گرجنے لگیں "یہ موا فرعون دھمکا رہا ہے مجھے" پٹا سے جوتی الطاف صاحب کی پیٹھ پر لگی "کھانا پانی بند کردے گا یہ توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دے گا مجھے" دو تین چپلیں اور رسید کی گئیں "اب تو ہرگز نہیں بھیجوں گی۔ جا تیرا جو جی چاہے کرلے"

اماں بی" الطاف صاحب غصہ گرمی بھول کر گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ادھر سے اوصاف صاحب ارے ارے کرتے لپکے۔ ان کے ہاتھ سے جوتی چھینی۔ دادی اماں رونے بیٹھ گئیں!۔

الطاف میاں۔ بات کرنے کا سلیقہ تمھیں کبھی نہیں آیا" اوصاف صاحب بولے "اماں بی، یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ ذرا سی بات پر۔ لاحول ولا قوۃ"

ہاں بھائی صاحب۔ بات ہی کیا ہے" الطاف صاحب اپنے کوٹ کی آستین پر سے چپل کی گرد جھاڑتے ہوئے بولے "میں نے کہہ تو دیا اماں بی سے۔ وہ سالی نمک حرام ماما چلی گئی ہے اپنی بیٹی کی زچگی میں۔ ادھر "انھوں" نے اچانک بستر سنبھالا ہے۔ کیا ایسے وقتوں میں بیٹی بیٹے گھر

کا کام نہیں کرتے ؟ ۔ آپ ہی انصاف کیجئے ! ۔ میں اسپتال چلا جاتا ہوں ۔ گھر اکیلا ہوتا ہے ۔ لونڈے ادھم مچاتے ہیں ۔ اک ذرا برکہ ہفتہ بھر کے لئے میرے ساتھ چلی چلے تو آخر اس میں قباحت کیا ہے ۔ میں وعدہ کرتا ہوں ۔ اگلے اتوار ہی کو خود پہونچا جاؤں گا ! ؛

ٹھیک ہے ٹھیک ہے ! ؛ اوصاف صاحب نے سر ہلا دیا ؛ کوئی قباحت نہیں ۔ ہفتہ بھر کے لئے لے جاؤ ۔

پھوپھی جان جو بے چاری ابھی تک خاموش بیٹھی ان کی جھڑپ سن رہی تھیں ۔ چپکے سے بولیں ؛ ہاجرہ بھابی سے پوچھ تو لیجئے ! ؛

کیا پوچھ لوں ہاجرہ سے ؟ ۔ لاحول ولاقوہ ؛ الطاف صاحب نے بڑا سا منہ بنایا ؛ تم لوگوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے ؛ انہیں غصہ آگیا ؛ اب میں زبردستی پر اتر آؤں گا ؛ انھوں نے مڑ کر برکہ کو حکم دیا ؛ اٹھو چلو میرے ساتھ ۔ میں رکشا لانے جا رہا ہوں ؛ یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے ! ۔

ہاجرہ بیگم جو اندر کمرے میں بیٹھی سب کچھ سن رہی تھیں ۔ وہ دالان میں آئیں ! ۔ ان کی بیمار شکل دیکھ کر برکہ کا دل بیٹھ گیا ۔

اوصاف صاحب نے انھیں سمجھایا ؛ لڑکی کو برائے چندے جانے دو بیٹی ۔ آخر وہ باپ ہیں ۔ کوئی دشمن نہیں ۔ وعدہ کر رہے ہیں کہ ہفتہ بھر بعد لے آئیں گے ۔ کیا فائدہ ہے کہ خواہ مخواہ کی ضد کر کے انھیں غصہ دلایا جائے ۔ ! ؛

خدمت ہی کے لئے میری برکہ یاد آتی ہے ! ؛ ہاجرہ کے گالوں پر آنسو

بہنے لگے۔ یوں کبھی بیٹی کی محبت نہیں ستاتی۔!

برکہ نے دل کڑا کر کے کہا "آپ کیوں دل بھاری کرتی ہیں امی. میرا وہاں جی نہ لگے گا۔ میں چلی آؤں گی۔!

ارے پچھلی بقر عید کے دفعہ پر لے گئے تھے۔ مارکے ان کی بیوی نے رُلا رُلا دیا بیچاری کو" ہاجرہ بولیں۔

برکہ بادل ناخواستہ اٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئی. ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں اپنے کپڑے رکھ لیے۔ دادی اماں غصے کے مارے اندر جا کے بیٹھ گئیں۔ برکہ ماں کو تسلیاں دینے لگی۔ اتنے میں الطاف صاحب آگئے۔ وہ ہاجرہ کو دیکھ کر وہیں رک گئے۔ لیکن ان کی نظروں سے نظریں مل گئیں۔!

آؤ۔ جلدی کرو۔! الطاف صاحب نے کہا اور وہیں سے باہر مڑ گئے.

ہاجرہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ تو بالکل نہیں بدلے۔ وہی چہرہ ہے۔ وہی بھرا بھرا ڈیل ڈول۔ اُف۔ انھوں نے پیچھے سرک کر دیوار سے سر ٹیک دیا۔ اور ڈھنگ سے سنا بھی نہیں کہ برکہ نے ان سے کیا کہا تھا۔

راستے میں الطاف صاحب نے بیٹی سے پوچھا "تمھاری امی یہاں کب آئیں؟!

"دس بارہ روز ہو گئے ڈیڈی!" برکہ بولی۔

اچھا" انھوں نے غیر اہم لہجے میں گلا صاف کر کے کہا۔ کیا کوئی خاص بات تھی؟!

"امی کو بہت دنوں سے بخار آرہا تھا ڈیڈی۔ دادی اماں جا کے لے

آئیں۔"

"اور وہ۔ کیا کہتے ہیں کرنل" وہ پھر کھانسے "میں پوچھ رہا تھا کہ۔ وہ۔ میجر صاحب اور اظہار بھی ان کے ساتھ آئے ہوں گے؟"

برکہ کو ان کی تفتیش پر غصہ آگیا۔ خواہ مخواہ کا بیر باندھ کے بیٹھ گئے ہیں ڈیڈی۔ اس نے جھنا کر جواب دیا۔

"کیوں نہ آتے ڈیڈی! اب وہی تو اس کے سب کچھ ہیں۔"

خاموش رہو۔ بہت بڑا اس کرنے لگی ہو۔" انھوں نے بھی جھنا کر کہا برکہ غصے کے مارے رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی! اس نے اپنی چھوٹی پھپھی سے سنا تھا کہ بہت ہی معمولی سے گھریلو جھگڑے پر برافروختہ ہو کر الطاف صاحب نے انھیں طلاق دے دی تھی چونکہ قصور الطاف صاحب ہی کا تھا۔ لہٰذا خاندان بھر کو ماجرہ بیگم سے ہمدردی تھی۔!

الطاف صاحب شروع دن سے غصہ ور، سخت گیر اور سنگدل تھے۔ ہر حالت میں اپنی مرضی بالا رکھتے۔ ان کے بھائی بہن بھی ان سے خوش نہیں رہتے تھے

اپنے باپ کا موازنہ اس نے میجر صاحب سے کیا۔ وہ کتنے نرم دل، خوش مزاج اور پُر محبت انسان تھے۔ ہمیشہ لوگوں نے انھیں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ غصہ تو انھیں آتا ہی نہ تھا۔ برکہ کو وہی اچھے لگتے تھے۔

پھر دفعتاً اسے اظہار یاد آگیا۔ اس کی گفتگو اس کے دل میں گونجی۔ اس کے سخت گیر ظالم ڈیڈی بھلا کب چاہیں گے کہ وہ اس کا ہاتھ مانگے۔ اظہار کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور بجنا اس بارے نے

ان کا کیا بگاڑا تھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی دینا گوارا نہیں کرتے۔ اوہ۔
خدایا۔ اس کی قسمت میں ایسے جلاد باپ کی بیٹی ہونا لکھا تھا۔ وہ ایسے
ہی بیدرد شوہر بھی رہے ہوں گے۔ امی کے بخار پر تشویش کا اظہار نہیں
کیا۔ حالانکہ ڈاکٹر بنے پھرتے ہیں!۔ دوسری باتوں پر برکہ کا خون جلانے
بیٹھ گئے!۔ ایسے آدمی کو باپ کون کہے!۔ وہ منہ پھیرے بیٹھی رہی!۔
بالآخر رکشا گھر پر پہونچ کر رک گیا!!۔

آفریں کی امی زینب خاتون کو اس کا مردانہ کالج میں پڑھنا اور
لڑکوں میں منہ سر کھولے پھرنا قطعی پسند نہ تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اتنی
قدامت پسند خاتون تھیں کہ انھیں لڑکیوں کی زیادہ تعلیم ہی غیر ضروری
لگتی تھی۔ آخر لڑکی ذات زیادہ پڑھ بھی جائے تو کرے گی کیا۔ وہی شوہر
کا بھگتانا، بچوں کی پرورش، اور گھر گرہستی۔ کون سا اسے گورنر منسٹر
بننا ہوتا ہے۔ وہ اگر کبھی سن لیتی تھیں کہ فلاں ملک کی وزیر ایک عورت
ہے یا ایک بہادر عورت کوہ پیما ہے۔ کسی جگہ عورت نے چیف جسٹس کا بڑا
عہدہ سنبھالا ہے تو وہ سرے سے باور ہی نہیں کرتی تھیں۔ چاہے لاکھ
بڑی بڑی قسمیں کھالے۔
عورت کا کام خانہ داری ہے۔ عورت کی تخلیق کا مقصد برائے تخلیق
ہے۔ وہ اسی وقت اچھی لگتی ہے جب اس کی گود میں پھول سا بچہ ہو۔

کسی دوسری پوزیشن میں وہ عورت کو قبول کرنے پر کبھی تیار ہی نہ ہوئیں۔
لہٰذا جب کبھی آفریں یونیورسٹی کے لئے گھر سے باہر نکلتی۔ وہ اسے نہایت ناگوار انداز میں گھورتیں اور جب تک وہ اصل خیر سے کسی "ٹوٹ پھوٹ" کے بغیر واپس نہ آجاتی۔ اللہ خیر منایا کرتیں!۔ اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں پر انھیں بڑا غصہ آتا جنھوں نے لڑکی کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اور انھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔

وہ چپکے چپکے آفریں کو ہدایا کرتیں: "نگوڑے چائے کافی پینے کو اگر کہیں بلائیں تو پینے مت بیٹھ جانا۔ ارے ہاں۔ ان خانہ خرابوں کا کیا ٹھیک۔ کچھ بھنگ ونگ ملادیں اور بیہوش لڑکی کو یہ کہہ کر اٹھوالیجائیں کہ اسے اس کے گھر پہونچانے دیتے ہیں۔ توبہ توبہ۔ خدا بچائے اور پھر جہاں مرضی ہوئے لے کے چلے جائیں۔ آفریں۔ بٹیا۔ مردوں میں سر ڈھانک کے رہا کرو۔ غیر مرد جو کھلا سر دیکھ لیتے ہیں تو قیامت کے دن عورتوں کے سر سے آگ نکلے گی۔ اچھا سنو۔ کوئی مرد جو تم سے ہنس کھیل کے بات تو نہیں کرتا۔ بیٹی۔ کبھی ان کے ساتھ ہنسا بولا نہ کرو۔ تم کو نہیں معلوم۔ تم ابھی بچی ہو۔ مرد ہنستے ہیں تو یہ سمجھو کہ وہ لڑکی کو اپنے پھندے میں الجھانے کے دل ہی دل میں منصوبے بنا رہے ہیں۔ مردوں سے ڈرا کرو بی بی۔ یہ بہت بری ذات ہوتی ہے!"

اسے انی کی بوسیدہ فرسودہ باتوں پر بڑی کوفت ہوتی تھی۔ جو رہ گئی بیسویں صدی کے روشن ماحول میں سانس لے رہی ہیں۔ اور قبل مسیح کی باتیں کرتی ہیں۔ بھلا اتنی زبردست یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل

کرنے والا مہذب لڑکا اس کا کیا بن رہے گا؟!

وہ دل میں تو بری طرح جھنجھلاتی تھی مگر بظاہر بڑی اسعادت مندی سے ان کی باتیں سنا کرتی اور منہ چبا کرتی۔ جس پوزیشن سے اس کے ملنے والے ہیں۔ بھلا اس پوزیشن کا بیچاری انہی کو ادراک کہاں۔

کیا وہ عزرا جیسے انسان سے کچھ خطرہ محسوس کرتی ہے۔

اپنے شریف اور سنجیدہ پروفیسروں کی نسبت اسے کچھ شک ہوتا۔ بے لوث تھا اس فیلو لڑکوں کی طرف سے بھی وہ قطعی بدگمان نہیں تھی۔ اور بیچارہ کب۔ اس کے تصورات کے طوفان میں کوئی بڑا زبردست دھکا لگتا!؟

مگر پھر وہ کون ہے؟۔

اسے خط لکھنے والا بے نام اجنبی۔

وہ بھی تو مرد ہے اور مسلسل ڈرائے جا رہا ہے۔

اور پھر اس کی رگ رگ سے جان کھنچنے لگتی۔

جانے۔ کیا انجام ہوگا۔ اگر کوئی خط اس کے گھر کے مردوں تک پہونچ جائے گا۔ یہ مرد۔ چاہے اپنے ہوں، چاہے پرائے۔ خوابیدہ آتش فشاں ہوتے ہیں۔ نجانے کب اپنی پوری شدت سے پھٹ پڑیں۔ کچھ پتہ نہیں!۔

نوشین سے چھوٹے بھائی تنظیم احمد فطرتاً اپنے چچا پر پڑے تھے۔ گویا کہ چچا نے۔ اپنا بھتیجے نے اٹھایا۔ ان سے آذرین بہت ڈرتی تھی! وہ بھی ویسی کرنے جو ان کا دل چاہتا تھا! فی الحال وہ انجینیرنگ لائن میں کسی قسم کی ٹریننگ کے سلسلے میں باہر رہتے تھے۔ اور اس کا امکان کم تھا کہ

وہ آفرین جیسی لڑکی کی تعلیم پر شک کرتے۔ مگر خدشہ تو ان کی طرف سے ضرور تھا۔ ہوسٹل سے گھر آتے اور اکثر باہر ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھ کر پڑھتے لکھتے رہتے۔ اور ان کی یہ عادت تھی۔ اگر کوئی خط آتا تو فوری مکتوب الیہ تک پہونچانے کے بجائے جیب میں رکھ لیتے۔ جب گھر کے اندر آتے تبھی خط دیتے۔ آفرین کے کئی خط انھوں نے اپنے ہاتھ سے اسے پکڑائے تھے!۔

آفرین ان دنوں گھر پر تھی!۔

اور وہ اسے اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ کر بے چاری اس کی امی سوچ رہی تھیں یہ ابھی کل تک جیسے گھٹنے پر پڑی تھی۔ اور آج!۔۔ ان کا دل دھڑک اٹھتا۔ موٹی اصلی خبر سے لڑکیوں کو ان کے گھر بار سے لگائے۔ جوان لڑکی ماں کا وہ جائز گناہ ہے جو بچانے کب ظاہر ہو جائے!۔

آفرین ماں کی نظریں پہچانتی تھی ان کے خیالات پہچانتی تھی۔ اور وہ زیادہ تر اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی تھی۔

ان دنوں برکہ بھی نہ تھی! ۔ سیر صاحب اور اظہار اپنے گھر چلے گئے تھے۔ آفرین کے دن بوجھل گزر رہے تھے!۔

باجرہ بیگم کی ملامت اور خود ساختہ فکروں نے ماحول کو زیادہ مغموم بنا دیا تھا! اس دن آفرین نے سوچا تھا کہ الطاف صاحب کے گھر جا کر وہ برکہ سے ملے گی اور پھر اظہار کو لے کر پکچر چلی جائے گی!۔

ناشتہ اس نے اپنے کمرے میں کیا۔

پھر لباس تبدیل کر کے رشیدہ کے پاس آئی!۔

اب کہاں کی تیاریاں ہیں؟! رشیدہ نے پوچھا۔

برکہ نہیں ہے جی نہیں لگ رہا!۔
آجائے گی برکہ۔ تم اس سے ملنے جا رہی ہو کیا؟۔
بھابی۔ سچ کہو۔ کیا تمھیں۔ ضرار صاحب کے ڈیڈی کی مجبوری بیچارگی یاد نہیں آتی؟۔
"آتی ہے آفریں۔ اس رات تو میں سو نہ سکی۔ بڑے میاں کا چہرہ نگاہوں میں پھرتا رہا۔ ان کی ہکلاتی ہوئی آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ مگر بھئی۔ مجھے تو ساتھ ساتھ ضرار صاحب پر غصہ بھی بہت آیا۔ آخر اپنے بیمار باپ کو اتنا ترساتے کیوں ہیں۔ پوری کیوں نہیں کر دیتے ان کی آرزو"۔
"ہاں سچ۔ انھیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ ایک سے ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی انھیں مل سکتی ہے"۔
"وہ تمھارے دوست کیسے ہوئے؟"
دوست نہیں ہیں" آفریں بے تعلقی سے بولی" کہاں وہ اور کہاں میں۔ بس تھوڑی سی شناسائی ہے!"
بہت جی چاہتا ہے ان کے ڈیڈی سے ملنے کا" مرشیہ نے کہا۔
تو پھر چلو نا بھابی۔ امی کو کیا پتہ چلے گا" آفریں نے خوشامد سے کہا۔
ہائے تو کیا امی سے چھپا کے چلنا ہے؟" مرشیہ ڈری۔
"اور پھر کیا۔ ایک تو امی فوراً کسی لڑکے کے گھر جانے کو منع کر دیں گی اوپر سے ان کی دوستی کا حال سنیں گی تو اور بھی زیادہ روک دیں گی۔
"مگر کیسے چلوں۔ تمھارے بھائی جان سے تو پوچھ لیں۔
بھائی جان کہاں ہیں؟۔

"بینک سے آدمی بلانے آیا تھا۔ اس کے ساتھ چلے گئے۔ مگر کیا اس وقت
ھزار صاحب سے ملنے جا رہی ہو تم؟"
"اکیلے ڈر لگتا ہے۔ انھوں نے جلدی واپس نہ آنے دیا تو پھر۔ اسی دن
دیکھئے کہ زبردستی کھانے پر ٹھہرا لیا"
"ہاں آفریں۔ یہی میں بھی کہہ رہی تھی کہ اکیلی نہ جانا۔ کسی کا کیا
ٹھیک؟"
"بھابی تم ھزار صاحب کے بارے میں کہہ رہی ہو؟"
نہیں وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ مگر اکیلے میں اچھے آدمی کے پاس ٹھہرنا
بھی کچھ خطرناک ہی لگتا ہے۔ عرشیہ نے ہنس کر کہا: "میں تمھارے
بھائی سے اجازت لے لوں۔ پھر ہم دونوں ساتھ چلیں گے!"
"اچھا۔ تو میں فی الحال برکہ سے مل آؤں!"
آفریں باہر نکلی۔ دالان کے تخت پر بیٹھے اوصاف صاحب ناشتہ
کر رہے تھے۔ ان کے پاس امی اور دادی اماں بھی تھیں۔ اتفاق سے
موضوع بحث آفریں ہی کی ذات تھی!
آفریں کے قدم وہیں جم گئے!
"مجھے بتائیے آخر آپ کو بڑی آپا کا لڑکا کیوں اچھا نہیں لگتا!" امی
کچھ ناخوشگوار لہجے میں کہہ رہی تھیں: "شاید بی۔ اے کر چکا ہے اور کسی
پرنسیں میں کام کر رہا ہے!"
"تم ذرا سمجھا کرو زینب!" ابا جان نے لقمہ منھ میں رکھا اور موٹی آواز
میں بولے: "مانا کہ تمھاری آپا کا لڑکا ہر طرح اچھا ہے۔ لیکن کیا ممکن ہے

کہ ایک پریس میں کام کرنے والے اور معمولی تنخواہ پانے والے کے ہاتھ میں میں اپنی بچی کا ہاتھ دے دوں۔ گنی بوٹی نیا شوربہ۔ اس کے تو شاید اور بھی بہن بھائی ہیں۔ اور پھر بیچاری بیوہ ماں کا خرچ بھی اسی کے سر ہے!"

"تو کیا ہوا۔ اللہ سب کا روزی رساں ہے!" امی بولیں "لڑکی اپنے نصیب کا رزق لے جائے گی۔ اب یہ تو ہوگا نہیں کہ آپا اس کی کہیں شادی ہی نہ کریں!"

"شوق سے کریں۔ مگر ہماری لڑکی سے نہ کریں!" ابا نے کہا۔

"میں دیکھتی ہوں اوصاف کہ تم بھی نئے زمانے کے رنگ میں رنگ گئے ہو!" دادی اماں نے کہا "اللہ رکھے۔ وہ جیسی کی ہو گئی ہے۔ یہی عمر شادی بیاہ کی ہے۔ کیا تمہاری سمجھ ہی میں نہیں ہے کہ سفید بالوں میں افشاں چھڑک کے لڑکی کو دلہن بناؤ گے!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں بی!" اوصاف صاحب اب در پردہ زچ ہونے لگے تھے "میں برابر اس فکر میں رہتا ہوں کہ آفریں کے قابل کوئی لڑکا ملے۔ وہ ماشاءاللہ صورت، سیرت کی اچھی ہے، پڑھ لکھ رہی ہے۔ اسے آنکھیں بند کر کے ایسے ویسے گھر میں جھونک دینا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں کندھے پر رکھا ہوا بوجھ تو اتار پھینکنا نہیں ہے نا اماں بی!"

"بڑی آپا کا گھر آپ کے نزدیک ایسا ویسا ہے؟" امی نے تیوریاں بدل لیں۔

"بڑی آپا کے گھر کا تذکرہ میں کہاں کر رہا ہوں!" اوصاف صاحب نے کہا "میرا مقصد تو یہ ہے کہ جس معیار کا ہم نے اپنی لڑکی کو پہنچا دیا

ہے اسی معیار کا لڑکا اسے ملے۔ کم از کم اس کے برابر یا اس سے زیادہ پڑھا ہوا۔ عمدہ ملازمت ہو۔ کنبہ مختصر ہو۔ وہ اپنی بیوی کو ڈھنگ سے رکھ سکے!"

"یہ تمام خوبیاں جس لڑکے میں ہوں گی وہ آپ سے پچاس ہزار جوڑے کے نام سے بھی مانگے گا۔ سمجھے آپ؟" امی نے جل کر کہا: "اور یہاں آپ نے لڑکی کے لیے کانی کوڑی بھی جوڑ کے نہیں رکھی ہے!"

"آج کل سبھی مانگ رہے ہیں بیگم!" اوصاف نے ناشتہ ختم کر کے رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا:

لڑکی والوں کے دماغ میں یہ خیال پتھر کی لکیر ہو گیا ہے کہ جب تک وہ لڑکے کی مٹھی گرم نہ کریں گے ان کی لڑکی سسرال میں ہرگز ہرگز خوش نہ رہ سکے گی۔ یوں مخالفت جہیز تحریکیں بہت چل رہی ہیں۔ لیکن جہیز نہ لینے والے بس خال خال ہی ہیں۔ بے چارے لڑکی والے چپ چپاتے دے دیتے ہیں۔ محض اپنی بچیا کے خوش آئند مستقبل کی خاطر۔ سو اگر مجھ سے بھی کوئی مانگے گا تو مجھے بھی جھک مار کے دینا ہی پڑے گا!"

"مانگنے والا لالچی بھک منگا لڑکا کبھی عالی ظرف شوہر نہیں ثابت ہو سکتا!" امی نے جواب دیا۔

"اور جو نہیں مانگتا۔ بڑا عالی ظرف ہوتا ہے۔ وہ عمر بھر اپنی بیوی کو کچھ نہ لانے کا طعنہ دیا کرتا ہے۔ اس کا جگر چھلنی کرتا ہے۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ہم پچاس ساٹھ ہزار میں ایک داماد خرید لیں۔ تاکہ ہماری لڑکی خوش تو رہ سکے۔ اس کا کلیجہ نہ جلے۔ اسے دقت نہ ہو!"

کہتے تو درست ہو۔ میاں!" دادی اماں نے بگلا سا سر ہلایا "مگر داماد کے خریدنے کی رقم کہاں ہے؟۔"

ابھی کوئی داماد نیلام ہونے کے لئے کھڑا ابھی تو نہیں ہوا ہے اماں بی!"

اوصاف صاحب کو خاصہ غصہ آگیا تھا "جب کبھی اس کی بولی لگے گی۔ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں آفریں کو اور پڑھاؤں گا۔ تعلیم کبھی بے کار نہیں جاتی۔ خدا نہ کرے کہ کبھی اس پر برا وقت آئے۔ لیکن یہ دنیا ہے۔ اور اچھے برے دن انسانوں کے درمیان گردش کرتے رہتے ہیں۔ لڑکی اتنا تو پڑھ لے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔"

امی ان کی دلیلوں سے قائل تو ہو گئیں۔ مگر بولیں "اس کی تعلیم میں آپا بھی روڑے نہ اٹکائیں!"

"روڑے خود بخود اٹکتے بھائی۔ آج شادی۔ کل حمل۔ پرسوں بچہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ شادی کے بعد تعلیم ذرا دشوار ہے۔ اچھا میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ ناصر علی صاحب تشریف لائیں اگر تو کہلوا دینا کہ براہ کرم بعد مغرب آئیں ان سے مجھے بڑا ضروری کام ہے!"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

دادی اماں نے پیالی کی بچی کھچی چائے سڑپتے ہوئے کہا "سب ٹھیک کہا تمھارے میاں نے۔ بی بی اک برائے چندے اور جلدی نہ کرو۔ نگوڑا جلدی کا کام شیطان کا۔ اللہ پر نظر رکھو۔ سونے میں سونے ہی کا ٹانکہ لگتا ہے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ لڑکی اپنی پڑھائی پوری کر لے۔

"میں سوچ رہی تھی اماں بی کہ آخر۔ برکہ کا فرض بھی تو ہے ہمارے ہی ذمہ ہے۔ زیاں طعنہ نہ دیں کہ اپنی لڑکی کے لئے سوچ لیا اور ان کی لڑکی کی فکر نہ کی۔ دونوں بچیوں کو ایک ساتھ اٹھانا چاہتی تھی میں"۔ اب اللہ ہی ہے"

"بیٹی ہول جول میں کام اچھا نہیں ہوتا"۔ پروردگار نے دونوں کا پیوند کہیں نہ کہیں رکھا ہی ہوگا۔ تمھاری خوشی ہے تو ایک ساتھ دونوں کو اٹھانا۔ خداوند کریم روپیہ تو دے اتنا"۔

وہ اٹھنے لگیں تب آفریں پاس آئی۔

"پھر کہیں جارہی ہو"۔ امی نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "چھٹیوں میں بھی تمھیں گھر پر ٹکنا نہیں آتا"۔

آفریں نے ناگواری سے کہا۔ "میں بھلا کہاں آتی جاتی ہوں امی۔ ذرا سوچا تھا اگر برکہ سے مل آؤں گی"۔

"ارے ہاں۔ اماں بی۔ آپ بھی جائیے۔ دیکھ آئیے نادرہ کو۔ آپ کا رشتہ ان سے یونہی بڑا ہے"۔ امی نے دادی اماں سے کہا۔

"کیوں جاؤں۔ الطاف نے مجھ سے خوشامد کی ہوتی تو میں ضرور جاتی"۔ دادی اماں نے تنک کر جواب دیا۔ "وہ تو حق جتا کے اپنی اولاد کو لے گیا نا۔ لے جائے۔ دیکھتی ہوں۔ اب اس سے کیسی خدمت لے گا"۔ "اور تم دلہن پھر کبھی مجھ سے نادرہ کے گھر آنے جانے کو نہ کہنا"۔ "ہاں"۔

"امی میں جاؤں؟" آفریں بور ہو گئی۔

"جاؤ۔ مگر جلدی چلی آنا"۔ امی نے کہا۔ وہ بے حد بیزار سی باہر نکلی۔

اور غفور میاں سے رکشہ لانے کو کہا۔ وہ ٹین کے شیڈ سے رکشا نکال ہی رہے تھے کہ دروازے سے گھنٹی بجاتا ہوا ڈاکیہ داخل ہوا۔ آفریں کے ہاتھ پیر سرد ہونے لگے۔ اس نے خطوں کے بنڈل کے اوپر نیلے لفافے رکھے دور ہی سے دیکھ لئے تھے۔

یا خدا! وہ کیا ہی۔

پوسٹ مین نے اسے خط پکڑائے اور سلام کر کے چلتا ہوا۔

"چلو بی بی۔ آؤ جلدی سے۔ پھر مجھے بھی کام سے جانا ہے"۔ غفور میاں کہہ رہے تھے۔

"ابھی۔ ابھی آتی ہوں"۔ اس نے پھولی پھولی سانسوں میں کہا اور پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی! دروازہ بند کیا۔ دھم سے کرسی پر گری۔ اور آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی! ہمت ہی نہ تھی کہ خط چاک کرتی۔ پرانی لن ترانی۔ وہی خرافات۔

کاش اسے پتہ چلتا کہ وہ کون ہے تو پھر۔

کچھ دیر بعد دل قابو میں آیا تو اس نے ایک لفافہ پھیلایا۔ ہمیشہ وہ بھول جاتی تھی کہ خط کی تہوں سے گلاب کی پنکھڑیاں گرتی ہیں اور ہمیشہ ہی وہ اچھل پڑتی تھی! جیسے گود میں سنپولے آگرے ہوں۔

پھر بے قرار نظریں سطروں پر لپکیں۔

میری رگ جاں سے زیادہ قریب۔

میرے دل کی دھڑکن۔

میری زندگی۔

تو یہاں جا کے چھپیں ہم نے وہیں دیکھ لیا. میسور، منگلور اور اوٹی
کی گہری آفریں فضا میں. سرسبز مرغزاروں میں. اونچی نیچی پگڈنڈیوں
پر. یہاں اور وہاں. ہر جگہ سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہا ہوں
کبھی آگے کبھی پیچھے. کبھی بڑی دور کبھی بہت نزدیک ۔ اتنے
نزدیک کہ تمھاری نرم و نازک سانسوں کا سندر زیر و بم بھی
سنتا اور دیکھتا رہا ہوں! بھلا آپ نے ان دلنواز لمحوں میں اس
ہستی کو کیوں یاد رکھا ہوگا. جو ہمیشہ سے آپ کی راہوں میں پڑی
پھرتی ہے. ایک ٹھوکر کا متمنی. آہا. اگر میں کبھی آپ کے سامنے
آجاؤں. یقین ہے کہ آپ کو ہرگز یقین نہ آئے گا. آپ کا پرستار
آپ کا خواہشمند، آپ کا چاہنے والا وہ ہے جو ــــ آپ"
اور یہ خط یکایک یہاں ختم ہو گیا۔

خدا تجھے غارت کر دے ۔ بے بسی کے آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے
اب کوئی چیز اسے رسوائی کے گڑھے میں گرنے سے بچا نہیں سکتی۔
دیر تک اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں میں خط لرزتا رہا. پھر اسے تکیے
کے نیچے چھپا کر اس نے دانت پیستے ہوئے دوسرا خط کھولا ۔

میرے سازِ ہستی کے ہوشربا نغمے، اب تو سمجھ ہی میں نہیں آتا
کہ تجھے القاب کیا لکھوں! ہائے آپ نے نجانے کیسا اثر مجھ
پر کر دیا ہے۔ دم بھر میں تیری یاد سے غافل نہیں رہتا ہے

پہلو میں کبھی چین سے یہ دل نہیں رہتا

آپ سوچیں گی کہ ایسا بزدل چاہنے والا بھی کہیں نہیں دیکھا

سچ ہے کہ میں وارفتہ وسرگشتہ حقیر سا پروانہ شمع حسن کے سامنے آنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دور ہی دور سے طواف کرتا اور آہستہ آہستہ زندگی کے سارے پنکھ جلا جلا کے خاک کیا کرتا ہوں۔ آہ ؎

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

میری تپش حیات۔

تو ملے یا نہ ملے یہ تو ہے تقدیر کے ہاتھ

لیکن میں یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ میں نے بھی آپ کو اسی طرح چاہا ہے جیسے کبھی قیس نے لیلیٰ کو اور ہیر نے رانجھا کو چاہا ہوگا۔ آپ سوچیں گی کہ میں نے فرہاد کا نام نہیں لیا۔ جی نہیں۔ میں اس بدنام کنندۂ عشق ومحبت کا نام نہیں لونگا اسے میں اپنے جذبے میں نرا خام سمجھتا ہوں۔ محبت تو از دل ریزد بر دل خیزد والے جذبے کا نام ہے۔ اس جذبے کو فرہاد صاحب نے ٹھیک سے سمجھا نہ تھا یا وہ کچھ نروس ہو گئے تھے کہ شیریں کی فرضی موت کی خبر سن کر ایسے سرگشتۂ رسوم وقیود ہوئے کہ مرنے کے لئے تیشے کے مرہونِ منت ہوئے۔ واہ بھئی۔ ثابت ہوا کہ ان کے دل نے جھوٹی خبر سچی مانی اور انھیں خواہ مخواہ رسوا کیا۔ خیر ہاں میں یہ خواہ مخواہ کا لیکچر دینے لگا ہوں آپ کا دھیان بھی ایسا نہ ہو کہ کہیں میرے جذبۂ الفت سے منحرف ہو جائے۔ خدا کے لئے مجھے اپنے جذبات میں کچا اور

سطحی نہ سمجھیئے گا۔ ورنہ پھر آپ کو یقین دلانے کے لئے مجھے بھی دنیا سے دوسرے تمام محبت کرنے والوں کی طرح ناشاد ونامراد رخصت ہونا پڑے گا۔ سچی بات تو یہ ہے محترمہ کہ مجھ میں نہ تو اظہار محبت کی جسارت ہے نہ میں اس چیز کو مستحسن سمجھتا ہوں ؎

مشک آنست کہ خود ببوید

وہ محبت ہی کیا ہوئی۔ جو تحریر سے نہ ظاہر ہو سکی۔ آنکھوں آنکھوں سے افسانے نہ کہہ سکی۔ خاموش زبان میں چیخ نہ سکی۔ چپکے چپکے اثر نہ کر سکی۔ لیکن۔ کیا معلوم۔ آپ اس پروانہ صفت خاموش محبت کو پسند بھی کرتی ہیں کہ آپ کو ساز محبت کا مضراب اظہار سے چھیڑنا ہی بھلا لگتا ہے؟!۔ خیر۔ یہ لن ترانی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی جبین ناز ک پر شکنیں ڈالنے کا باعث بن رہی ہے۔ لیجئے! اس موضوع کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں۔

آپ کو عمدہ شعر تو ضرور اپیل کرتے ہوں گے؟ شعر وسخن کی تو آپ خود روح ہیں۔ بہرکیف عرض ہے ؎

اپنی تخلیق میں انسان کو شامل کر کے
دکھ اٹھائیں ہیں خدا جانے خدا نے کتنے

وہی " دامن یزداں " چاک والی ناز آفریں گستاخی ہے نا۔

اور سنئے۔

میخانے سے باہر تک جھنکار چلی آئی
یہ کس کا شیشہ ٹوٹا یہ کون شرابی ہے

اسے کہتے ہیں غنائی نشہ! محاکات نگاری میں یہ جھنکار ۔۔۔؟
اور میری روح ۔ یہ بھی سنئے ۔

محبت تم سے کی میں نے تمہارے بے وفا ہوتے
اگر تم باوفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا؟

قندِ مکرّر کے بعد اجازت چاہتا ہوں "۔۔۔۔۔ آپ کا"

جب اس نے خط دیکھے تو محسوس کیا کہ پسینے میں نہا چکی ہے۔ اور دل بیمار نپ کے دل کی طرح دھڑک رہا ہے۔ سانسوں کا ہجوم سینے پر اکٹھا ہو گیا ہے اور اسے پریشان کر رہا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ رونے کے لئے اس کے پاس آنسو بھی نہ تھے۔ خوف نے آنسو خشک کر دئے تھے!۔

دیر تک وہ ایک پہلو پر بیٹھی فرش کو تکتی رہی۔ اور فرش وہ اسکرین بن گیا جس پر باری باری دھندلے چہرے ابھرتے رہے، مٹتے رہے۔ جمیل، پروفیسر شاہد، ریاض، حفیظ صاحب۔ دبلا پتلا شاعر شاہین۔

کون ہو سکتا ہے ان میں سے ۔۔؟!۔

وہ شریر لڑکیاں۔ شہلا عارف، درخشاں تبسم، تزئین سلطانہ، سلمیٰ حسین۔ آخر کون ۔۔۔؟!۔

نہیں۔ ان سب میں اتنی مہذب لیکن اتنی گہری تحریر لکھنے کا شعور

نہیں ہے۔ یہ کوئی پڑھا لکھا اور شریف بدمعاش ہے!۔

اس کا طائر خیال دور دور کی خبریں لانے اُڑا اور ناکام و نامراد واپس پھر اسی کے جوف دماغ میں پر پھڑپھڑانے لگا۔

کیا وہ یہ سارے خط بھائی جان کے آگے رکھ دے۔ پھر اسکی روح پر پڑا ہوا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ وہ بعد کو آنے والے تمام خط انہی کو دے دے گی۔ مگر وہ پوچھیں گے اب تک کیوں خاموش رہی تھیں؟۔

ہو سکتا ہے کہ بات آگے بڑھے، پھیلے اور ابا جان تک جا پہونچے۔ امی سے چھپائی جائے۔ بس پھر انجام معلوم ہے۔ فوراً وہ گھر بٹھالی جائے گی۔ اپنی بدنامی امی کبھی برداشت نہ کریں گی۔ اور ان کے مضبوط ارادے سے دب کر ابا جان اور بھائی جان بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے وہ دونوں خود بھی اپنی شریف لڑکی کی خفیف سی رسوائی برداشت نہ کر سکیں گے؟۔

رشیدہ یا برکہ سے کہنا چاہیئے!۔ مگر نہیں۔ وہ بے چاری لڑکیاں اس سلسلے میں کیا کر سکیں گی؟۔

پھر ایک خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں لپکا۔ اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹھیک ہے۔ ہرچہ بادا باد۔ وہ ابھی اور اسی وقت تمام خط لے جائے گی اور مرزا احمد خاں کے سامنے رکھ دے گی۔ اس کا سا مہذب، شریف اور سنجیدہ انسان کم از کم اسے دوسرا ایسا نہیں مل سکتا۔ جو اس کا راز فاش بھی نہ کرے۔ اور اس گمنام خبیث کا پتہ بھی چلا سکے۔ ٹھیک بالکل ٹھیک۔۔۔ اس وقت گھر پر [illegible]

ایک پُرعزم فیصلہ کرکے وہ اٹھی۔ الماری کے خفیہ خانے سے تمام خط نکالے انھیں کاغذ میں لپیٹا اور پرس میں رکھ کر پھر باہر نکلی۔ دادی اماں ناشتے کے بعد سو چکی تھیں۔ امی غالباً حمام میں تھیں۔ وہ دونوں سے اجازت لے ہی چکی تھی۔ مگر غفور میاں اس کا انتظار کرکے جا چکے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اس نے دروازے کے پاس آکے ایک رکشا کرایہ کا کیا اور شہزاد احمد خاں کا پتہ بتا کر اندر جا بیٹھی۔

غم و غصے کے احساسات نے اس کے دل سے ڈر اور خوف کے تمام خیالات کو بھسم کر ڈالا تھا! رکشا اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ وہ سوچتی رہی! کس پیرایہ میں ان سے تذکرہ کرے گی کہ اب اس کی جان پر بن گئی ہے۔

اس کا خیال صحیح نکلا۔ شہزاد اپنے گھر پر تھا جب آفریں نے اپنی آمد کی خبر اسے پہنچائی تو اسے یقین نہ آیا۔ وہ خود برآمدے میں چلا آیا۔ آفریں نے دیکھا کہ اسے اپنے گھر پر پاکر حیرت و تعجب کے ناقابل یقین سائے اس کے بے حد سنجیدہ چہرے پر چھا گئے ہیں! حتیٰ کہ وہ ایک لفظ تقدیم کی خاطر بھی نہ کہہ سکا۔

"آداب!" کچھ جھینپ کر اور خجل ہو کر آفریں نے کہا۔ اس کا دل دھڑکا۔ نجانے یہ کیا سمجھیں گے؟ غیر آدمی ہی تو ہیں۔ بہت دنوں کی

جان پہچان بھی نہیں۔ بہت خشک اور محتاط ہیں۔ انھیں لڑکیوں سے نفرت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سوچنے لگیں کہ ان کے قرب کی خاطر آفریں نے یہ بہانہ تلاش کیا ہے !"

آفریں کے کان جل اٹھے اور جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا۔ بہت سے خیالات ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے میں آ گئے۔ اور اسے تکلیف دہ خلش میں مبتلا کر گئے !۔ اس نے امید و بیم کی عجیب سی سکرات آمیز کیفیت میں عزار کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ صدیوں سے ایک پتھر کے بت کی طرح اسی جگہ استادہ ہے۔ عزار نے اس کے سلام کا جواب مدتوں بعد دیا ہے۔

لیکن عزار نے فوراً کہا تھا: "آداب !۔ آئیے۔ اندر چلئے"

اس نے من من بھر کے وزنی قدم اٹھائے: اور اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں پہونچی۔ عزار نے ہاتھ بڑھا کر سیلنگ فین آن کیا اور روشنی کر دی۔ پھر بے حد سنجیدگی سے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھئے !"

سیدھا سادا لہجہ، خشک انداز، نہ اس کے آنے کی خوشی — نہ استعجاب کا اظہار۔ نہ کوئی گرم جوشانہ التفات !۔ اس کے اس سلوک سے آفریں کی ہمت بڑھ گئی۔

"آپ تب تک صبح کے یہ اخبار دیکھئے۔ میں ابھی آیا" عزار نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ سنئیے !" وہ جلدی سے بولی۔

وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

آپ سے اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بات کیسے شروع کرے۔
آفریں آپ بیٹھ تو جائیے۔ کھڑی کیوں ہیں؟!"
آپ بھی بیٹھئے" وہ بے ساختہ بول پڑی۔
میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ کافی یا چائے کے لئے کہہ آؤں۔ ٹھنڈی چیز آپ نہیں پئیں گی۔ کیونکہ دسمبر کے دن ہیں"!
نہیں نہیں" اس نے طفلانہ انداز میں ضد کی" مجھے کچھ پینا نہیں ہے میں کھا پی کے آئی ہوں۔!"
ادھر شزاد واپس آکر صوفہ پہ ٹک گیا۔ پھر اس نے کوئی اصرار نہیں کیا۔ آفریں نے بھی اپنی نشست سنبھالی۔
شزاد کی بے پناہ سنجیدگی جہاں اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی وہاں حوصلہ فرسائی بھی کر رہی تھی!۔ اس نے ایک مرتبہ اس کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔
شزاد نے سگریٹ سلگایا۔ اور ایک طویل کش کے بعد دھواں اگل کے ان کے نقش و نگار پر نظریں جما دیں۔
"ہم۔ میں۔ آپ سے۔ کچھ کہنے آئی تھی" آفریں جی کڑا کر کے بولی۔
"فرمائیے!"
مگر آپ کا مغائرانہ سلوک مجھے کچھ کہنے نہیں دیتا!"
"مغائرانہ سلوک؟۔ کیا مطلب!۔ میں نہیں سمجھا"
آپ اتنے ادب اور تکلف سے مجھ مخاطب کر رہے ہیں کہ جیسے آپ نے پہلی دفعہ مجھے دیکھا ہے۔

اچھا۔ یہ بات ہے ؟" وہ خفیف سا مسکرایا "بھئی میں نے سوچا کہ کہیں آپ کو میری بے تکلفی اور اپنائیت ناگوار نہ گزرے "

بس آپ ہی کی بے تکلفی مجھے ناگوار نہیں گزرتی ! "

بہت بہت ــــــ !"

آفریں نے اس کی بات کاٹ دی "شکریہ ادا کرکے آپ پھر غیریت کا ثبوت دیں گے .... !"

میں غیر ہی تو ہوں ! "ضرار نے کہا

مجھے آپ کی اپنائیت اچھی لگتی ہے۔ آپ پر مجھے پورا بھروسہ ہے " آفریں نے بڑے خلوص سے اور بے حد گداز لہجہ میں کہا۔

" اوہ ! " اس نے مدھم آواز میں بس اتنا کہا اور سر جھکا کر دوسرا سگریٹ جلانے لگا !۔

تب آفریں نے اس کی طرف دیکھا۔ نجانے کیا بات تھی۔ وہ اسے بیحد پریشان حال مضطرب اور کچھ بے چین سا دیکھ رہی تھی۔ بے ترتیب بال گھر کے لباس میں ملبوس۔ گالوں پر شاید ہفتہ بھر کی داڑھی پھیلی تھی !۔ مونچھوں کا خوفناک جنگل بتا رہا تھا کہ اس کی طرف تو قطعی توجہ ہی نہیں دی گئی ا۔

کچھ دیر تک کمرے میں صرف پنکھے کی سنسناہٹ گونجتی رہی !۔ پھر آفریں نے کہا "میں اپنی ایک دشواری لے کے آپ کے پاس آئی ہوں !"

کہو دو آفریں "

اس روز کی باتیں شاید آپ کو یاد ہوں " ہچکچا کر آفریں نے کہا "

میں نے آپ سے ان خطوں کا تذکرہ کیا تھا جو بجانے کون گمنام آدمی مجھے پریشان کرنے کے لئے لکھتا ہے!"

ہاں ہاں۔ یاد آیا مجھے" ضرار سنبھل کر بیٹھ گیا۔

دیکھئے پھر وہی خط" آفریں نے کہا اور اپنے پرس سے ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اور پھر اسے بے اختیار رونا آگیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔

اوہو" وہ گھبرا گیا" روحمت۔ آفریں۔ رومت۔ مجھے بتاؤ پوری بات کیا ہے۔ شاید میں تمھارے لئے کچھ کر سکوں"

آفریں نے آنسو پونچھے مگر روتی آواز میں بولی: آپ ہی کچھ کر سکیں گے۔ اور تو کوئی مجھے ایسا نظر نہیں آتا۔ سچ مچ۔ ان خطوں نے مجھے رسوائی اور جگ ہنسائی کی خطرناک منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم میرا نادیدہ دشمن کون ہے جو محبت کے پردے میں مجھ سے کسی بات کا انتقام لے رہا ہے۔ مجھے بدنام کرنا مجھے تباہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ یقین کیجئے۔ میں نہیں جانتی۔ یہ کون آدمی ہے۔ اور مجھ سے کیا چاہتا ہے!؟ کیا فائدہ ہوگا اسے۔ اگر مجھے کالج سے اٹھا لیا جائے گا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ اور پھر" وہ سسکنے لگی" مجھے جاہل اور کمزور لڑکی کی طرح کسی دوسرے گھر میں ہمیشہ کے لئے جھونک دیا جائیگا"

یہ بات تو ہے" اس نے بے حد مدھم لہجے میں کہا۔

"اگر کوئی خط ابا جان کے ہاتھ لگے۔ کوئی خط میرے بھائی وصول کریں تب۔ تب کیا ہوگا!" اس نے سرخ بھبھوکا چہرہ اٹھایا: ضرم

کے مارے میں تو ڈوب مروں گی۔ اگر کسی نے یہ خط میرے پاس دیکھ لئے۔"

"فوراً جلا دیا کرو ان خرافات کو۔ اپنے پاس رکھتی کیوں ہو؟"

"جلا دیا کروں؟" آفریں اچھل پڑی۔ "سچ سچ۔ مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ مگر۔ اس سے کیا۔ خطوں کی آمد کو کون روکے گا؟" مجھے ہمیشہ یہ اندیشہ تو لگا ہی رہے گا کہ کب کوئی واہیات تحریر کسی کے ہاتھ لگتی ہے!"

جب بھی کوئی تحریر کسی کے ہاتھ لگے۔ تم فوراً کہہ سکتی ہو کہ یہی پہلا خط ہے اور تم نہیں جانتیں کہ کس نے لکھا ہے!"

آپ تو نئی نئی باتیں کہہ رہے ہیں!" آفریں تعجب سے اسے دیکھنے لگی!"

اس کے سوا میں تمھیں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ آفریں۔ جب کہ میں خود بھی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے تمھیں تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔"

کوئی پڑھا لکھا شریف بدمعاش ہے!" بڑے جوش میں آفریں نے کہا۔

اچھا!" ضرار کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ "تمھیں اس کا پتہ کیسے چلا؟"

آپ ایک آدھ خط پڑھ کے تو دیکھئے!" آفریں نے کہا۔ پھر وہ یک لخت شرما گئی۔ "فضولیات کی بھرمار تو اس میں بھی ہے۔ مگر بڑے سلیقے سے ہے!۔ گہری باتیں، فلسفیانہ انداز، منتخب اشعار۔ اور میں کیا کہوں۔ شرم آتی ہے مجھے۔ آپ خود پڑھ لیجئے نا!"

"یہ بنڈل چھوڑ جاؤ میرے پاس۔ اطمینان اور فرصت سے پڑھوں گا!"

"اور اندازہ لگائیے گا کہ یہ کس کی تحریر ہو سکتی ہے۔ آپ کے پاس تو میگزین کے لئے بجانے کن کن کی تحریر آتی ہو گی"۔

"تم بڑی معصومانہ باتیں کر لیتی ہو آفریں!"

جی؟" اس نے خجالت و تعجب سے پوچھا۔

جو شخص اپنا نام تک ظاہر نہ کرتا ہو۔ اس قدر محتاط ہو۔ وہ بھلا اپنی تحریر کو عام کیوں کرنے لگا!"

یہ تو ہے!" وہ نروس سا ہو گئی "پھر اب کیا ہو گا؟"

کچھ نہیں ہو گا۔ پریشان مت ہو۔

مگر آپ اس بات کو اپنے تک رکھئے گا۔

بالکل!۔

تو پھر میں اب ——!" وہ اٹھنے لگی۔

ضرار نے جلدی سے بات کاٹ دی اور بولا "ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں!"

"پوچھئے"

ان محبت ناموں سے تم اتنی بیزار کیوں ہو؟" وہ مسکرایا۔

میں محبت کے نام سے الرجک ہوں!" آفریں نے کہا "میں اس جذبے کو بالکل نہیں مانتی۔

تعجب ہے۔ حالانکہ تم افسانہ نگار ہو۔ تمہارا ہر افسانہ محبت ہی کے ہالے میں محصور ہوتا ہے" ضرار نے کہا "کیا وہ سب فرضی اور افسانوی سی باتیں ہوتی ہیں۔ آفریں کیا ان میں حقیقت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا؟"

بالکل نہیں"۔ وہ بڑے اطمینان سے ہنسنے لگی: "وہ سب فرضی جھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ اپنا کوئی رومان زدہ افسانہ پڑھ کر میں تو بہت ہنستی ہوں"!

حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ ہر کوئی افسانہ نگار واردات قلب کا عکاس ہوتا ہے۔ جو اس پر گزرتی ہے۔ وہی کہتا ہے۔ افسانہ نویس کا دل گداز، محسوسات لطیف، تجربہ سچا اور تحریر شخصیت و حیات کی آئینہ دار ہونی چاہیئے۔ لیکن۔ تمھارا نظریہ میرے خیالات کی قطعی نفی کر رہا ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے!"

تو کیا آپ کو اس حماقت پر یقین ہے"!

حماقت؟" ضرار نے بے پناہ سنجیدگی سے دہرایا: "محبت کو حماقت نہ کہو۔ آفریں۔ یہ وہ جذبہ ہے۔ جس کی سچائی، اور سنجیدگی پر کبھی نہ کبھی ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اور میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ کہ جو شخص محبت کو نہیں مانتا۔ وہ خدا کو بھی نہیں مانتا!۔

لیکن آج کل کی واہیات محبت ——" آفریں اس کی سنجیدگی سے مرعوب ہو کر ہکلانے لگی!

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ"! ضرار نے کچھ ہنس کر کہا: "کیا یہ احساس اپنی شدت کھو بھی سکتا ہے؟۔ یہ کہیں کم ہے کہیں زیادہ ہے۔ کہیں جھوٹا ہے کہیں سچا ہے۔ لیکن موجود تو ہے۔ اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا تم ہی سچ سچ بتاؤ۔ کیا تمھارا دل محبت سے یکسر خالی ہے؟؟ اس میں کسی کے لئے کہیں کوئی گدا: نہیں۔ تڑپ

نہیں۔ تپش نہیں؟؟؟!!

کیا یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا عامیانہ طریقے سے اظہار بھی کیا جائے؟
کان کی لوؤں تک سرخ ہو کر آفریں بولی

یہ بے شک تم نے بڑی قیمتی بات کہی ہے" ضرار نے کہا "اظہار محبت خودداری کے منافی ہے۔ چاہے انسان سلگ سلگ کے خاکستر ہو جائے۔ لیکن کبھی ظاہر نہ کرے کہ کس آگ نے اسے پھونک دیا ہے"

آپ بڑی شدت سے اس احساس کے قائل معلوم ہوتے ہیں"
آفریں ایک پھیکی کھوکھلی ہنسی ہنس پڑی۔

حالانکہ میں کوئی افسانہ نگار نہیں۔ شدت سے قائل تو تمھیں ہونا چاہیے تھا" وہ بھی ہنسنے لگا۔ لیکن آفریں نے بھانپ لیا۔ اس کی ہنسی بالکل بناوٹی تھی۔ اوپری دل سے آئی تھی۔

ایک دو لمحوں بعد آفریں نے پھر اجازت چاہی!۔

"تمھیں جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟"

میں کسی سے کہہ کے نہیں آئی۔ میں نے برکہ کے پاس جانے کی اجازت لی تھی۔ دیر ہو جائے گی تو ——!"

لیکن اب۔ تو۔ دوپہر کے کھانے کا وقت قریب ہے" ضرار نے کہا اور پھر۔ تم ڈیڈی سے بھی نہیں ملیں۔ وہ تو اکثر تمھیں پوچھتے ہیں۔ تمھارا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس چلو"

ان سے مل کے چلی جاؤں گی۔ مجھے برکہ کے پاس بھی جانا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے جھوٹ کی پول کھل جائے!"

کھانا نہیں کھاؤ گی؟!۔

جی نہیں۔"

کھانے کے بعد میں خود تمھیں گاڑی میں چھوڑ آؤں گا!"

نہیں نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔

ہر بات میں نہیں نہیں۔ ہر وقت نہیں نہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ آفریں جھینپ گئی۔

ضرار اٹھ گیا: "آؤ چلو۔ اگر ڈیڈی جاگ رہے ہوں تو۔ اچھا ہے۔ ورنہ۔ وہ سوتے سے اٹھائے جاتے ہیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔"

ضرار نے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے اپنے ڈیڈی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اطلاع دی کہ۔ بڑے سرکار ابھی ابھی سوئے ہیں۔

آفریں نے غیرارادی طور پر اطمینان کی سانس لی۔

یہ بہانہ بھی ہاتھ سے گیا۔" ضرار نے کہا: "میں نے سوچا تھا کہ شاید ڈیڈی ہی سے ملنے کے بہانے تم کچھ دیر اور ٹھہر سکو گی!"

"اب مجھے جانے دیجئے۔ دیکھئے۔ برکی سے ملنا ضروری ہے۔"

آفریں؟۔

جی!۔

کیا وجہ ہے۔ تم نے کبھی مجھے میرے نام سے مخاطب نہیں کیا۔" ضرار کا چہرہ متبسم ہو گیا: "ہمیشہ دیکھئے اور سنئے سے کام چلاتی ہو۔ میرا نام کیسا تمھیں بہت برا لگتا ہے؟؟"

نہیں نہیں۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بول پڑی۔

پھر دہی نہیں نہیں "؛ مزار نے قہقہہ لگایا۔

امی کہتی ہیں کہ جو اپنے سے بڑا ہو۔ اس کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ میں اپنے بھائیوں کے نام بھی کہاں لیتی ہوں!"

آفریں کی تاویل بڑی معصومانہ تھی لیکن مزار کے چہرے سے تبسم یوں غائب ہوا۔ جیسے گہن لگنے سے چاند کی روشنی!۔

مزار نے بڑی افسردگی اور سنجیدگی سے اسے خدا حافظ کہا۔ دور جانے کے بعد آفریں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک اپنے گیٹ پر کھڑا تھا!۔

برکہ نے آفریں کو دیکھ کر اس قدر حیرت و تعجب کا اظہار کیا کہ شاید مزار نے اسے اپنے گھر پر دیکھ کر بھی نہیں کیا تھا۔

"کیسے راستہ بھول گئیں آج"؛ برکہ نے اسے گھورا؛ "ظاہر ہے کہ تم چھوٹی ممی کی مزاج پرسی کے لئے تو آئی نہ ہو گی؟"

"اپنے چچا کے گھر آئی ہوں"؛ آفریں بولی۔ "مگر یہ تمہارا حلیہ کیسا ہے۔ پاگل خانے سے چھوٹ کر بھاگی ہو کیا؟"

"آؤ اندر چلو تو تفصیل سے بتاؤں!"، برکہ کراہی۔

"کیسی ہیں۔ محترمہ چھوٹی چچی"؛ آفریں بولی۔

"اب آئی ہی ہو تو چھوٹوں ان کی مزاج پرسی بھی کر لو۔ ورنہ کچھ شکایت ہو گی!۔

چلو!"

برکہ کی چھوٹی ممی، آفریں کی چھوٹی چچی اور بیگم الطاف نادرہ بیگم اپنی جہازی سائز کی مسہری پر دراز تھیں اور واقعی بیمار لگ رہی تھیں

چہرہ بخار کی حدت سے سیاہی مائل سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں نشے باز دل کی سی چڑھی ہوئی، گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔

آفریں نے انھیں سلام کیا۔

جواب دے کر وہ ہانپنے لگیں: "ارے۔ اور کوئی نہیں آیا۔ تمھارے ساتھ۔ سب نے ذات باہر کر دیا ہے مجھے۔ برکہ۔ ارے تمھارے ڈیڈی آئے کر وہ بھی بیزار ہو گئے۔ ہائے۔ یہ بخار تو پھونکے دیتا ہے۔ کسی کو بلاؤ۔ کسی سے کچھ پوچھو۔ کوئی میرا بخار دور کیے اُف۔ اُف۔ ایک آگ سی لگی ہے تن بدن میں!"

"ڈیڈی جلدی ہی آنے کا وعدہ کر گئے ہیں چھوٹی ممی" برکہ بولی۔ "آپ کچھ پئیں گی؟ کافی لاؤں؟"

"ارے نہیں"، وہ بلند آواز میں کراہنے لگیں: "کافی تو اور پھونک دے گی۔ تم تو۔ مجھے برف کے پانی میں۔ ڈبو دو۔ یہ انجکشنوں کی گرمی ہے شاید۔ تمھارے ڈیڈی۔ بس۔ انجکشن پھونک دیتے ہیں۔ ارے اللہ۔ اُف اُف۔

"میں آپ کا سر دبا دوں چھوٹی چچی" آفریں نے کہا۔

"تم تو بیٹی ذرا ان شیطانوں کا شور بند کرا دو۔ ان خبیثوں کی آواز سے سر کے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں" وہ بولیں۔

آفریں نے چونک کر سنا صحن میں لڑکے تالیاں بجا بجا کر چیخ رہے تھے۔ نغمے لگا رہے تھے۔

برکھا بہار آئی   رس کی پھوار لائی
آم ڈالی امرود لائی   بن کے مورنا مودانی آئی

"یہ کیا ہے؟" آفریں نے تعجب سے کہا۔

"اسی طرح چڑھاتے ہیں مجھے!" برکہ نے مغموم آواز میں کہا۔ "ڈیڈی ان کو کچھ نہیں کہتے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم اثر نہ لو۔ بکنے دو۔"

"جاؤ تم لوگ باہر جا کے بیٹھو!" نادرہ بیگم نے کہا۔ "میں اکیلے لیٹوں گی مجھے سب کی صورتوں سے وحشت ہوتی ہے۔"

دونوں کمرے سے نکل آئیں۔ آفریں نے دیکھا کہ اس کے سوتیلے چچا زاد بھائی آنگن میں اودھم مچا رہے تھے۔ بے چاری برکہ کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

"ان کی طرف مت دیکھو میرے ساتھ آؤ۔" برکہ آفریں کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے آئی۔

"یہ کیا تماشہ ہے۔ ان بچوں کو ماں کی بیماری کا بھی احساس نہیں۔" آفریں بولی۔

"انھیں بچے نہ کہو!" برکہ نے سر تھام لیا۔ "یہ تینوں شیطان کے بھی باپ ہیں۔ اُف توبہ۔ میں تو چند روز ہی میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ ہائے آفریں۔ تم جا کے دادی اماں سے کہو کہ مجھے بلوا بھیجیں۔ میرا ایک ایک لمحہ دوزخ میں کٹ رہا ہے۔ صبح سویرے سے جو کام میں اُلجھتی ہوں تو پھر رات تک۔ اور رات کو بھی وہ محترمہ چین لینے نہیں دیتیں۔ سر دباؤ۔ پسلیاں سینکو۔ دودھ گرم کر کے لے آؤ۔ خدا کی پناہ۔ پھر صبح ہوئی نہیں کہ وہی گھن چکر۔ ناشتہ تیار کرنا، ان حرامیوں کو تیار کر کے اسکول بھجوانا، گھر کی صفائی کرنا۔ ڈیڈی کے کام کرنا۔ ارے باپ رے۔ اسی لئے تو ماما بہانہ بنا کر

بھاگ گئی ہے!"

"چچا جان کسی اور ملازمہ کا بندوبست کیوں نہیں کرتے۔ سارے ستم تمھاری ہی جان پر کیوں ڈھا رکھے ہیں!"

"کوئی ملازمہ نہیں آتی۔ اب تو بیگم صاحبہ کے نخرے اور ان شیاطین کے کرتوت سب کو معلوم ہو چکے ہیں۔ مامائیں اور خادم دور ہی سے ہاتھ جوڑ کے بھاگتے ہیں!"

"تو پھر یہاں سے تمھاری نجات ہو گی بھی کہ نہیں!"

"اگر نہیں ہو گی تو بھاگ آؤں گی!"

"چھوٹی چچی کو ہوا کیا ہے؟"

"میں جب آئی ہوں تو بیچ میں انھیں بڑا تیز بخار تھا۔ بڑ کہہ بھر بھر کا لے کر بولیں: ہذیان بک رہی تھیں۔ ڈیڈی نے آئس بیگ سر پر رکھوائی بجانے کون کون سے انجکشن دیئے۔ صبح کے قریب ان کے حواس ذرا درست ہوئے تھے۔"

"چچا جان ہی علاج کر رہے ہیں!"

"ہاں!"

"اب بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں نظر آتی!"

"ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ مگر ——— !"

"مگر ———؟"

"چھوٹی امّی نے پرہیز نہیں کیا۔ اک ذرا سا بیچ سے بخار اترا ہوا تھا۔ انھوں نے بہو ... سے ارے خوب چٹپٹی کھالیں ان بچا کے ملنے کی چیزیں کھا کے

سالن کھائی تھیں۔ منہ کا مزہ پھیکا ہو رہا تھا ان کا!"

"ہائے اللہ۔ تو پھر۔!" آفریں نے دل تھام لیا۔

"ڈیڈی نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ خوب چیخے چلائے تھے۔ مگر کیا ہوا۔ ان کا بخار پھر بڑھ گیا اور اب تو خوب تیز ہے۔ خدا ہی خیر کرے!"

"چچا جان کیا کہتے ہیں پھر!" آفریں نے سہم کر پوچھا۔

"ڈیڈی تو کہتے ہیں کہ اگر اچھی نہ ہوئیں تو مر جائیں گی!"

آفریں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ برکہ نے منہ بنا لیا۔

"تم ابھی بیٹھو گی کہ جاؤ گی؟" برکہ نے پوچھا۔

"برکہ سنو۔ میں ضرار صاحب کے پاس سے آ رہی ہوں۔"

"نہیں!" وہ اچھل پڑی۔

"سچی!۔ کہنا مت کسی سے۔" آفریں نے کہا پھر برکہ سے مختصر سی تفصیل میں اپنی دشواری کی داستان کہی۔ لیکن برکہ نے اس سنجیدہ پرابلم کو بالکل اہمیت نہ دی۔ بولی

"ارے تم بھی کہاں جا دل سکھانے بیٹھ گئیں۔ بہت سے شریر لڑکے لڑکیوں کو خواہ مخواہ چھیڑ کر لطف لیتے ہیں۔ وہ سنجیدہ نہیں ہوتے۔ تم بھی اسے اہمیت مت دو۔ کیا ضرار بھائی جان اتنی سی بات نہیں سمجھیں گے؟"

آفریں چپ ہو کر سوچنے لگی۔

"تم ضرار بھائی کے ڈیڈی سے کبھی ملیں؟!"۔

"نہیں۔ وہ [illegible] تھے!"۔

"شاید۔ بخاطر [illegible] ہوں گی ان [illegible]۔"

کھانے پر رُک رہے تھے۔ کافی پلا رہے تھے۔ میں نے نہ کھایا نہ پیا۔"

"بہت برا کیا!"

"کیا ____؟"

"اتنے اچھے آدمی ہیں۔ اتنے معصوم ایسے پُر محبت۔ مجھے وہ بے حد اچھے لگتے ہیں۔ میں ان کا دل توڑنا گناہ سمجھتی ہوں!"

"مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ تمھارے پاس بھی تو آنا تھا!"

"اچھا۔ امی ہیں کہ چلی گئیں؟"

"ہیں۔ میجر صاحب اور اظہار البنز چلے گئے۔"

"اچھا ____!"

دن کے دو ڈھائی بج رہے تھے جب ڈاکٹر الطاف احمد بھی آ گئے۔

"آداب چچا جان!" آفریں ان کے سامنے جھک گئی۔

انھوں نے زیر لب کچھ کہا اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے بے حد تشویش سے پوچھا۔

"کیسی رہیں وہ!؟"

"بہر کر نے ہسٹری دی۔ اور اپنی طرف سے بھی کافی مصالحے لگا دیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے دانت پیسے۔ "جی چاہتا ہے کہ تھوڑی پھلکیاں بدبخت کو اور ٹھنسا دوں! ـ لاحول ولاقوۃ۔"

"کچھ پریشانی کی بات ہے چچا جان؟" آفریں نے پوچھا۔

"بیٹی۔ ٹائیفائیڈ واپس پلٹ آیا ہے۔ اگر آسانی سے نہ گیا تو انھیں بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔" انھوں نے کہا اور بیوی کے کمرے کی طرف

چلے گئے۔ برکہ اور آفریں بچن کی خبر لینے پہونچیں۔ لڑکے باپ کو دیکھ کر پچھواڑے بھاگ گئے تھے!۔ ایک بوجھل دن آہستہ آہستہ ان پر مسلط ہو رہا تھا۔"

ضرار کے مختصر ترین کنبہ سے اب توصیف نے بالکل خاندانی قسم کے تعلقات استوار کر لئے تھے۔ توصیف اپنے دفتر سے واپسی پر ہر دوسرے تیسرے روز اس کے گھر چلے جاتے۔ انھوں نے عرشیہ کو بھی دو تین بار ضرار کے والد کے اصرار پر لے جا کے ان سے ملایا تھا۔ لیکن ضرار شاید جان بوجھ کر توصیف کے گھر نہیں آیا۔ عرشیہ نے ضرار کی کس مپرسی اور اس کے والد کی بے چارگی کی ایسی تصویر زینب خاتون کے سامنے کھینچی تھی کہ وہ ان کے حسب منشا متاثر ہو گئیں۔ اور سر تا پا عبرت بن کے بولیں۔

"اسی لئے تو کہتے ہیں بیٹی کہ دولت کبھی کسی کے سکون کا باعث نہیں بن سکتی۔ بے چارے رہتے ہیں ایک نواب زادے کی طرح۔ اور حالات دیکھو تو درویشوں سے بدتر۔ اے میں کہتی ہوں دلھن۔ انھوں نے تم کو بہن بنایا ہے۔ تم نے ان سے کہا نہیں کہ آخر کیا وجہ ہے جو وہ اپنے باپ کی مرضی پر شادی نہیں کرتے؟۔ انھیں تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل جائے گی!!"

امی وہ اپنے دل کا پتہ دیں تو!" عرشیہ بولی: "بس گڑبڑ گول مول بات

کر کے ٹال جاتے ہیں!"

"رہنے دو بیٹی اپنے کالج میں کسی کو دیکھ رکھا ہو گا!"

"نہیں امی۔ وہ ایسے نیچے آدمی نہیں ہیں۔ آپ ان سے ملنے کے بعد ہی کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں گی!"

"تو صبیحہ سے کہتے کہتے میرا دل بھی چاہنے لگا ہے کہ کبھی ان کے والد کی عیادت کے بہانے جاؤں!" امی نے کہا۔

"ضرور جائیے۔ اور دیکھئے کیسی عجیب زندگی ہے۔ دونوں باپ بیٹے کی۔ باپ معذور بیٹا مجبور!"

نوکر چاکر نہیں ہیں؟" امی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"ہیں۔ مگر نوکر چاکر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں!"

بیٹی تم اگلی دفعہ جانا تو کہنا کہ آپ کو امی بلا رہی ہیں۔

"اچھا امی!"

اب دیکھو ادھر کا بھی ایک عذاب سر پر مسلط ہے۔ کل الطاف میاں نے نوکر بھیج کر بلایا تھا۔ نادرہ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں تو جا رہی ہوں اماں بی کے ساتھ۔ تم اور آفریں گھر سنبھال لینا!"

کیا حالت بگڑ گئی ہے چھوٹی چچی کی؟" عرشیہ نے ڈر کر پوچھا۔

"بی بی۔ نگوڑے بچوں ہی کو یہ موا میعادی بخار آتا ہے تو کھانے پینے کا اتنا پرہیز کراتے ہیں۔ نہ کہ بڑے اگر بخار میں بدپرہیزی کریں تو پھر ان کا بیڑا ڈوبا ہی سمجھو!"

تو کیا خدا نخواستہ...

موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے۔ مگر آدمی کو احتیاط تو کرنا ہی چاہیئے۔"

"تو پھر آپ جا رہی ہیں؟"

ہاں! ۔ پتہ نہیں کب آؤں۔ ہاجرہ یہیں ہیں۔ اگر افتخار بھائی اور اظہار آئیں تو انہیں کھانا دے دینا اور رات کے لئے سامنے کر دینا۔"

دیکھئے نا امی۔ چچاجان کی دونوں ہی بیویاں بیمار ہیں۔ یہ یہاں وہ وہاں؟" عرشیہ نے اپنی دانست میں بڑا چٹکلہ کہا تھا مگر امی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اوئی بچی۔ ہاجرہ اب ان کی بیوی کاہے کے لئے رہیں؟"

اماں اور زینب خاتون کے جانے کے بعد عرشیہ تو کچن کی طرف چلی گئی اور آفریں دالان میں آ بیٹھی دفعتاً اظہار باہر سے آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا پارسل تھا!۔

کیا لائے ہو بھیا؟" آفریں نے خوش ہو کر پوچھا۔

یہ لو۔ مجھ سے پوچھ رہی ہو؟" اظہار بولا اور پارسل آفریں کے سامنے میز پر رکھ دیا۔" ڈاکیہ باہر کھڑا ہے۔ رسید پر دستخط کر کے پارسل وصول کر لو میرے نام ہے؟" آفریں نے بھونچکا ہو کر کہا۔ "بھیجا کس نے ہے؟"

"ارے یہ سب بعد کو سوچنا۔ ڈاکیہ باہر کھڑا اکڑا جا رہا ہوگا۔"

اظہار نے اس کے ہاتھ پاؤں ایسے پھلائے۔ کہ اسے دستخط کرتے ہی بنی۔ اظہار نے آفریں کی اجازت لئے بغیر پارسل ادھیڑنا شروع کر دیا۔ ہاجرہ بیگم بھی آ کے بیٹھ گئی تھیں!۔ اور بڑے اشتیاق سے منتظر تھیں کہ پارسل کے اندر سے کیا نکلتا ہے۔

اور آفریں پارسل پہ مرسل کا نام دیکھ کر سرد ہو رہی تھی! ایک طرف کونے میں تحریر تھا۔

"آپ کا تیتی۔ اور پتہ کی جگہ" نزام پوسٹ آفس ... بنجارہ ہلز" تحریر تھا۔

آفریں بھلا وہ سوار خط کیسے نہ پہچانتی؟ وہی تحریر تھی جانی پہچانی۔ جو اس کے کرب و عذاب کا باعث تھی!۔

اظہار نے نعرہ لگایا۔ آفریں چونک پڑی۔

اظہار نے پنکی سے پکڑ کر ایک ایک چیز نکالی۔

"ساڑیاں چھ عدد۔ عمدہ۔ بلاؤز کے پیس۔ اور اللہ آپ کو نیکی کی توفیق دے۔ شلوار سوٹ مع دوپٹے نصف درجن!۔ عطر کی شیشیاں ہو بہو۔ محترمہ آفریں۔ یہ کون اللہ کی بندی ہیں جناب فینی صاحبہ۔ ارے ان سے میرا تعارف کرادو۔ تمہارے ساتھ پڑھتی ہیں کیا؟"

آفریں کی حلق میں گویا روڑا سا اٹک گیا۔

"سچ مچ ساڑیاں اور یہ شلوار سوٹ تو بہت عمدہ ہیں!" بابرہ بیگم نے کہا۔

بہانے بہانے سے آفریں نے ریپر کا وہ حصہ اٹھا لیا جس پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ تھا اور جانے بوجھے بے خیالی میں پرزے پرزے کرتی رہی۔ اس کے خیالوں میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ جس میں اس کا وجود منتشر ہو کے بہا جا رہا تھا۔ اب تو حد ہو چکی۔ کیا چاہتا ہے یہ بے درد ظالم۔ وہ خودکشی کرلے۔ یا اپنوں میں رسوا ہو جائے۔ کتنا مکار ہے۔ کوئی جواز نہ

لے اس لئے فین کو فینی بنا دیا۔ لڑکیوں میں ایسے ہلکے پھلکے نام عام ہیں۔ کسی کو شبہ نہ ہوگا؟۔

اس کی کنپٹی کی رگیں چٹخی جا رہی تھیں۔ ہُنہہ۔ نزار صاحب جو بڑے مدبّر بنتے ہیں۔ وہ بھی کچھ نہ کر سکے!۔ خواہ مخواہ میں نے اپنا وقار بھی کھو دیا۔ اب یہی ایک تدبیر ہے کہ وہ گھر بیٹھ جائے اور ادبیت کو بھی سلام کرے۔ زندگی ہی خطرے میں پڑ چکی ہے۔ اس نے سوچا۔ اسے آج نہیں تو کل اگر اس کی شادی ہو گئی اور اس جانی دشمن نے تب بھی پیچھا نہ چھوڑا تو پھر خود کشی ہی مقدر ہو جائے گی۔ شاید ماں باپ اسے اس قصہ نا مرضیہ میں ملوث نہ سمجھیں۔ انھیں اس پر ترس آ جائے مگر وہ نیا آدمی جو اس کی قسمت کا ساتھی ہوگا۔ وہ بھلا کیونکر یقین کرے گا؟ کیا ہوگا تب؟؟

سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ دماغ ماؤف تھا حواس پراگندہ۔ ایک بڑی تباہی اسے اپنی طرف بڑھتی دکھائی دے رہی تھی!۔ کون ہے وہ۔ کیا چاہتا ہے۔ اگر اس سے محبت ہے تو پھر سامنے آئے اور اس کا ہاتھ طلب کرے!۔

دفعتاً اسے دالان میں ایک شور سا سنائی دیا۔ اور اظہار نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اس کا چہرہ وحشتوں کا آماجگاہ نظر آ رہا تھا!۔

"آفریں۔ بڑا غضب ہو گیا"۔

کیا ہوا!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا"۔

"کیا؟!!"

ہاں، ابھی ابھی ان کا کمپاؤنڈر اطلاع دے گیا ہے۔"

ہائے، چچا جان کا اندیشہ غلط نہ تھا۔ اس نے دل تھام لیا۔

چلو گی تم؟

مجھے ان آخری رسوم سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اظہار بھیا! کیا تم جا رہے ہو؟

نہ بابا۔ ڈاکٹر صاحب کا صدمہ دو چند ہو جائے گا میری صورت دیکھ کر"

اور انکل؟"

"پتہ نہیں۔ میں ان سے ابھی ملا کہاں۔ صبح سے تو یہیں ہوں!"

آفریں جب باہر نکلی تو اسے ماجدہ بیگم ملیں۔ بڑی بدحواس تھیں۔

تم ابھی جاؤ گی؟ انھوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اور پھر ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔

اظہار بولا۔

آفریں اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ کھلنڈرے سے لوگ جب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو کوئی دوسرا آدمی لگتے ہیں۔

آفریں جب اپنے چچا کے گھر پہونچی تو اس نے سب کو خاموش دیکھا۔ نہ آہ و بکا کے طوفان نہ نالہ و شیون کے سیلاب۔ چچا جان ایک کرسی پر گم صم بیٹھے تھے۔ اور سلمان صاحب اپنے تینوں بھتیجوں کو لئے برآمدے میں نکل گئے تھے۔ اور سب خاموش۔ نادرہ بیگم کے بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار سب باہر تھے۔ اور فی الحال ان کی موت پر سچے دل سے آنسو بہانے والا شاید کوئی نہ تھا۔ اماں بی۔ امی اور برکہ بھی نہیں۔ ورنہ انھیں بھی ہوتی

ہے۔ آفریں اپنے غم نصیب چچا کے پاس جا بیٹھی مگر مرنے والی کے بارے میں کچھ نہ بول سکی۔ وہ بیچارے رہ رہ کے آہیں بھر لیتے تھے۔

اماں اور آفریں کی امی میّت کے قریب بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھیں پھر برکہ نے آفریں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

رات ہی سے ان کے آثار برے تھے" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "بس کراہے جا رہی تھیں۔ ڈیڈی نے کہہ دیا تھا اپنی سانسیں پوری کر رہی ہیں۔"

"کسی کو بلایا نہیں چچا جان نے؟"

"ارے ڈیڈی بڑے ظالم ہو گئے ہیں آفریں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ دادی اماں اور چچی بی کو بلائیے تو کہنے لگے کہ کیا وہ آ کے ان میں روح پھونکیں گی۔ پھر بولے کہ یہ میرے ظلم کا بدلہ مجھے ملا ہے۔ مجھی کو بھگتنے دو۔"

کیا مطلب؟ برکہ!" آفریں تعجب سے بولی۔

برکہ نے اور آواز دبائی "شاید اب انھیں اپنی زیادتی کا احساس ہو رہا ہے۔ کوئی بیسوں بار مجھ سے تم کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ خوش تو رہتی ہیں۔ مجھے یاد تو نہ کرتی ہوں گی۔ میں نے انھیں دیا بھی کیا ہے۔ اور جب نے کیا کیا ہے کہ اب بڑھاپے میں ڈیڈی پر شفقت کا بھوت سوار ہوا ہے!"

ہش! برکہ، چپ رہو۔ انسان کے دل کی حالت بھول بھلیوں کی سی ہے۔ ان میں کیسے کیسے احساسات اور جذبات چکر اتے پھرتے ہیں یہ تو انسان خود بھی نہیں جانتا!"

لوگ آتے رہے۔ گھر بھرتا رہا۔ اور اب واقعی وحشت انگیز فضا

ہو چکی تھی۔ نادرہ بیگم کی کوئی سی رشتے کی بہن بھانجی آئی تھیں اور چیخیں مار

مغرب سے قبل نادرہ بیگم کا جنازہ گھر سے نکلا۔

دروازے تک مرنے والی کو رخصت کرنے کے لئے بہت سی خواتین آگئی تھیں۔ آفریں بھی آئی اور تب اس نے گیٹ کی جھجری سے دیکھا۔ وہاں تو میت کے ساتھ ضرار بھی آیا تھا۔ اس نے سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا۔ اور کسی سے کندھا بدل رہا تھا۔

آفریں کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ اسے دور تک دیکھا کی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کا کوئی اپنا بہت ہی قریبی عزیز محض اس کی خاطر اس جگہ آیا ہو۔ پھر جنازہ نظروں سے اوجھل ہوا اور سب خواتین بھی روتی سسکتی آہیں بھرتی گھر کی طرف پلٹ آئیں لیکن بے خود و بے خبر سی آفریں ابھی تک اسی سمت نگاہیں لگائے کھڑی تھی۔ جہاں خلا میں اسے ابھی تک ضرار کا قد آدم ہیولی جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا!!۔

نادرہ بیگم کی ناگہانی رحلت نے خاندانوں میں بڑے مسائل پیدا کر دئے اپنے تینوں لڑکوں کو لے کر ڈاکٹر صاحب بڑے بھائی کے پاس آگئے! چونکہ اماں بی ان کے گھر رہنے پر آمادہ نہ تھیں۔ اور وہ بھی ضعیف ہو چکی تھیں ان سے گھر سنبھالنا بچوں کی دیکھ ریکھ کرنا قطعی ناممکن تھا۔ اور

چونکہ زینب بیگم اپنا گھر بار چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب کے گھر نہیں رہ سکتی تھیں لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے اوصاف صاحب کے یہاں چلے آنا مناسب سمجھا۔ جب وہ یہاں آئے۔ اسی شام کو میجر صاحب نے اظہار کو بھیج کر ہاجرہ بیگم کو بلوا لیا۔ طوعاً و کرہاً ہاجرہ بیگم کو جانا پڑا۔ میجر صاحب خلاف گرم نظر آرہے تھے۔

تم بہت متاثر نظر آرہی ہو" انھوں نے اپنی فطرت کے خلاف برہم لہجے میں پوچھا۔

اور سعید جیسے سادے لہجے میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہاجرہ نے جواب دیا۔ "سبھی کو افسوس ہوا اتنا۔ چھوٹے چھوٹے تین لڑکے ______

مگر تمھارا افسوس مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ سمجھیں!"

آپ کی بھی باتیں" ہاجرہ نے کہا۔ "میں نادرہ بیگم کے مرنے تک یہاں تو گئی نہیں تھی!"

اچھا کیا" میجر صاحب نے کہا "وہ جب تک ڈاکٹر الطاف اپنے گھر چلے نہیں جاتے۔ تم اپنی سابقہ سسرال ابھی نہیں جا سکتیں۔ میں پوچھتا ہوں ہاجرہ۔ اب اس جگہ سے تمھیں دلچسپی کیوں ہے۔ کیا واسطہ ہے تمھارا ان لوگوں سے؟ تم اظہار کی پھوپھی کے پاس ہفتہ بھر بھی رہنا پسند نہیں کرتیں۔ اور اوصاف صاحب کے یہاں ہفتوں رک جاتی ہو!"

کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟" ہاجرہ بیگم نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاجرہ۔ ان دس برسوں میں کوئی بات میں نے ایسی نہیں کی جو

تمھاری دل آزاری کا باعث بنی۔ ہر وقت تمھاری دل جوئی دلدہی کرتا رہا ہوں۔ تمھیں زیادہ سے زیادہ آرام پہونچانے کی کوشش کی ہے! اور میں اپنی حماقت کے زعم میں یہ سمجھتا رہا کہ اب تم میری وفادار ہو۔ صرف میری ہو۔ اپنا ماضی تم اسی گھر میں دفن کر آئی ہو۔ جہاں وہ ابھرا تھا۔ اور تمھاری زندگی میں خاصہ تکلیف دہ موڑ آگیا تھا:۔ لیکن میرا خیال بالکل غلط نکلا۔ اب میں اپنا مقدمہ انصاف کے لئے کس کے سامنے رکھوں!۔؟

میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھی!: سخت متوحش ہو کر ہاجرہ نے کہا۔

میجر صاحب اور یہ تلملیں؟۔ ناممکن سی بات تھی!۔ ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا وہ پشت کے پیچھے ہاتھ باندھے دالان میں ٹہل رہے تھے!۔ بیوی کی بات سن کر وہ رُکے اور ان کی طرف مڑ کر استہزائیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگے۔ ایسی تپش انگیز نظریں تھیں کہ ہاجرہ بیگم دیر تک ان سے نگاہیں نہ ملا سکیں۔ ان کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔

"ثبوت چاہتی ہو تم!"

آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے!"

اچھا خیر۔ تم ہی سچی سہی!" انھوں نے آدھ بھر کر کہا!" میں تمھیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتا!"

"لیکن آپ نے جو مجھے خواہ مخواہ اتنی باتیں سنا ئی ہیں۔ مجھ پر شک کیا ہے۔ اس کا مداوا کیا ہوگا؟" ہاجرہ بیگم کو غصہ آیا۔

میں تمھیں اب بھی چاہتا ہوں!" عجیب سے لہجہ میں انھوں نے کہا اور

پھر یکبارگی پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے!۔

یا خدا۔ ان کی باتوں کا مطلب کیا ہے!! باجرہ بیگم مبہوت و ششدر سی وہیں بیٹھی سوچتی رہیں!۔

میں تمھیں اب بھی چاہتا ہوں۔

میں تمھیں اب بھی چاہتا ہوں۔

ایک زہر آلود خنجر تھا جو بار بار باجرہ بیگم کے دل میں تیر رہا تھا۔ رگیں کاٹ رہا تھا۔ کیا مطلب "اب بھی"! یہ کیا مطلب تھا؟! انھوں نے ان کی کیا بے وفائی محسوس کی تھی؟!۔

وہ سوچتی رہیں۔ گوناگوں خیالوں نے ان پر ایک ساتھ یلغار کی تھی۔ وہ اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ میجر صاحب کے پاس جا کر اس پریشان کن معمہ کو حل نہ کر سکیں!۔ پھر ان کے شب و روز بڑے بے کیف اور پھیکے گزرنے لگے۔ کیونکہ نجانے کیوں میجر صاحب بے حد چڑچڑے غصہ ور اور بدمزاج ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی طبیعت کی یہ تبدیلی نہ صرف باجرہ اور اظہار کے لئے حیرت ناک تھی، بلکہ ملنے والوں کے لئے تعجب انگیز۔ وہ تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کسی کو اس برہمی کی کوئی وجہ نہ بتاتے۔

دادی اماں پر اپنی بہو کے انتقال کا بہت گہرا اثر ہوا تھا۔ جیسے کہ وہ بولنا ہی بھول چکی تھیں!۔ کوئی دلداری کرتا تو رو دیتیں۔

جوان زندگی کو موت نے نہیں چھوڑا!۔ وہ بیحد غم انگیز لہجے میں کہتیں میں تو اپنی عمر کو پہونچ چکی ہوں۔ دنیا دیکھ لی۔ پتہ نہیں کب موت کا ایک دھکا مجھے قبر کے کھلے منہ میں گرا دے!!

الطاف صاحب اگر تسلیاں دیتے تو وہ بچوں کی سی ضد کرتیں کہ ان کے سامنے لڑکیوں کو ان کے گھر بار کا کر دیا جائے۔ یہ سننا وہ پسند ہی نہ کرتی تھیں کہ لڑکیاں ابھی کم عمر ہیں یا وہ تعلیم پا رہی ہیں۔ تعلیم ان کے نزدیک نا اہمیات چیز تھی اور عمر کی نسبت وہ سند پیش کرتی تھیں کہ لڑکی نو برس کی عمر میں شادی کے قابل ہو جاتی ہے۔ نئے زمانے اور نئی روشنی کے تعلق سے پیدا ہونے والے سوالات ان کے لئے محض مہمل اور بے معنی تھے۔

پھر انھوں نے اپنی بیٹی عزیزہ کے دیور سفیان پر زور دینا شروع کیا۔ ان کے داماد کمال احمد بڑے شریف اور نیک آدمی تھے۔ سفیان ان کا چھوٹا بھائی تھا اور بزنس مینجمنٹ کا کورس کر رہا تھا۔ اسے اپنے عمدہ مستقبل کے لئے کوئی تگ و دو نہیں کرنی تھی۔ وہ محفوظ تھا۔

الطاف نے بھی سوچنا شروع کیا۔ "ہوں۔ سفیان؟ لیکن عزیزہ سے پوچھنا پڑے گا۔ اس کا رشتہ اس کے والدین نے کہیں طے تو نہیں کر رکھا ہے؟"

"اگر وہ کنوارا کھرا نکلا تو پھر؟" دادی اماں نے بے حد شوق سے کہا۔

تو پھر ہلکی سی سانس لے کر الطاف صاحب بولے: "لڑکی کو اٹھانا تو ہے ہی۔ اچھا ہے وہ پھوپھی کی نظروں کے سامنے رہے گی!"

"مگر اکیلی تمہاری لڑکی نہیں۔ بڑکے کے لیے بھی سوچو!"

اس موقع پر زینب بیگم جلدی سے بول اٹھیں: "اگر الطاف میاں کی مرضی ہو تو انہار کیا برا ہے؟"

اظہار؟" الطاف صاحب شدت سے چونکے!۔

"کیوں اس میں کون سے کیڑے پڑ گئے" دادی اماں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا "نام چار کا رشتہ ہے بھائی کا۔ ویسے خاندان بعد ا۔ ہڈی مختلف!۔

"میرا دماغ بالکل مفلوج ہو چکا ہے۔ اماں بی" الطاف صاحب نے ان سے بڑھ کر ناگوار لہجے میں کہا "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا گھر جو برباد ہوا ہے۔ اب اس کا کیا ہوگا۔ گرہستی دیکھنا۔ بونڈوں کی پرورش اپنی ملازمت اور کلینک کی دیکھ بھال۔ خدا کی پناہ۔ میں بڑے عذابوں میں گرفتار ہوں۔ اپنی زندگی کا کوئی ادھچھور مجھے نظر نہیں آتا۔ میں رشتے ناطے جوڑنے کے موقف میں نہیں ہوں۔ سمجھیں آپ؟!"

میں نے کئی دفعہ کہا ہے تم سے" ادھ الطاف صاحب بولے "تمھارے لئے اسی گھر کی رہائش کون سی ضروری ہے۔ وہ تمھارا ذاتی گھر تو ہے نہیں!۔ سامان اٹھالاؤ۔ ہمارے ساتھ رہو۔ لڑکوں کو زینب دیکھ لیں گی!۔ اور کیا چاہئے" انھوں نے تادیبی نظروں سے بیٹی کو گھورا۔

اور کیا!" وہ بلندی سے بولیں "بچے ماشاء اللہ سمجھداری کی عمروں میں ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کیا کرنی ہے!"

اماں بی کو ناگوار تو نہیں گزرے گا؟" نجانے کس دھن میں الطاف صاحب کی زبان سے نکل گیا۔

کچھ دیوانہ ہوا ہے الطاف؟" اماں بی سلگ اٹھیں "انہی باتوں سے میری ہڈی جلتی ہے!۔ ہمیشہ تو نے خود کو الگ تھلگ رکھا، ہمیشہ ہمیں

خیر سمجھتا رہا۔ جو کام کیے سب اپنی مرضی سے۔ خود رائی کی سزا بھگتی۔ دو گھر اجاڑ دیے۔ اور اب پھر ——— "

"معاف کیجیے!" الطاف صاحب نے جلدی سے معافی مانگ لی۔ "میں تجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ میرے منہ سے ایک بے تکی بات نکل گئی۔ تو پھر بھائی صاحب؟"

"چلے آؤ میاں۔ اس میں استخارہ کیا دیکھنا ہے۔" اوصاف صاحب بولے۔

پھر بڑی دھکا پچھاڑ مچی۔

خوب ہنگامہ۔ مدتوں سے بند پڑے ہوئے کمروں کی از سر نو صفائی۔ دوسرے تیسرے روز اوصاف صاحب جا کے اپنے بھائی کو اپنے گھر لے آئے۔

یونیورسٹی کھلے تب سات روز ہو چکے تھے۔ اور ایک تیز چانس تھی جو آفرین سے چھپ رہی تھی۔ انہوں نے بہت سے مسائل اکٹھا کر کے از سر نو ذہن کے راستے رکھے تھے۔ اس کی ساکھ بہت خطرے میں تھی! الطاف صاحب اور آفرین کے تب سے بیٹا تنظیم احمد باہر ان کے کمرے میں نروس رہتے تھے۔ ڈر ڈالے گئے تیز جیسے منہ اٹھائے ادھر ہی گھس جاتے تھے۔ اگر گمنام خطوں کی بارش بند نہ ہو سکی۔ اگر عزار صاحب اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کر سکے تو پھر ——— اس کے آگے سوچتے اس کا آدھا خون خشک ہو جاتا!۔

بر کہ اپنے ڈیڈی اور سوتیلے بھائیوں کے سلسلے میں خاصی مصروف

ہو چکی تھی!۔ اور گھر کے ناپسندیدہ ماحول سے آفریں بیزار تھی لہٰذا اس نے فرار ہی میں نجات دیکھی۔ کئی روز کے بعد یونیورسٹی جارہی تھی۔ لیکن بیحد بیزار اور اکتائی ہوئی سی۔ اس نے کوئی کتاب اپنے ساتھ نہیں لی صرف قلم گریبان میں اٹکایا اور چل پڑی!۔ اس کا ارادہ کلاس اٹنڈ کرنے کا نہ تھا!۔

یونیورسٹی کی دنیا اس کے گھر کی دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ روشن، منور، بے فکر لڑکے، مسکراتی ہوئی لڑکیاں۔ جیسے انہیں دنیا کی کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ اداسی کا نام بھی نہیں جانتے تھے!۔

کیا یہ سب مجھ سے چھوٹ جائے گا؟۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔

اوہ۔ ہیلو۔ مس آفریں!" اس کا کلاس فیلو تھا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔

"مجلہ ملا آپ کو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"میں آج ہی آئی ہوں۔ ہفتہ بھر غیر حاضر رہی تھی!۔

اچھا اچھا۔ آپ آئیے میرے ساتھ کامن روم تک۔ پلیز۔ آپ کا پرچہ وہاں رکھ چھوڑا ہے میں نے ویسے روز آپ کا انتظار کرتا تھا! اور صاحب گھر پر قدم رنجہ فرمانے کی ہمت نہیں ہوئی"۔ وہ ہنسنے لگا۔"اکثر بزرگ حضرات اس چیز کو پسند نہیں کرتے!!"

"ہاں!" وہ اس کے ساتھ کامن روم تک آئی۔ محسن نے اسے یونیورسٹی میگزین دیا اور ساتھ ہی تعریف بھی رسید کر دی"بہت عمدہ لکھا ہے آپ نے۔ "ٹوٹتے ہوئے پتوار" واہ۔ مسٹر ہزار کا خیال ہے کہ اس

سال کی سب سے بہترین تحریر ہے یہ!"

اس کا دل پرشکش انداز میں دھڑکا۔

"پتہ نہیں۔ وہ آج نہیں آئے کہ نہیں!" محسن بولا۔ "ان کا چپراسی سکندر خاں کہہ رہا تھا کہ ان کے والد بہت بیمار ہیں۔ پور اولڈ فیلو۔ مجھے تو ان کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوتی ہے!"

وہ چپ رہی۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں! آج آپ کے پروفیسر صدیقی صاحب نہیں آئے۔ شاید آپ بھی پورا وقت فری ہیں۔ اچھا۔ بائے!"

"خدا حافظ!" اس کے لبوں پر ہوا سرسرائی۔

چار بجے تک وقت اس کی ملکیت تھا۔

وہ لیڈیز روم میں واپس آئی۔ اور اپنی سوکھی ہوئی حلق کو بھگونے کے لئے گوشے میں رکھی ہوئی صراحی اٹھا کر لبوں سے لگالی۔

لیکن اس وقت تو گرفت میں نہ آنے والے جذبے دماغ سے پھسل پھسل کر حلق میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ دہکتے ہوئے جذبے، شعلہ آشام، جنھوں نے بدن کی محدود کائنات میں آگ سی لگا رکھی تھی!۔ اور بے قابو آگ اس کی کسی کوشش سے بجھنے والی نہ تھی!۔

بہت قوی اور تیز جھونکے تھے جو اسے کہیں لے جانا چاہتے تھے اور وہ شعلوں کے بھنور میں گھری چکرا رہی تھی۔ وہ خود پر قابو نہ پا سکی!۔ اس نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا جو اسے دیکھتا۔ لیکن دل کا چور بے شمار فرضی آنکھیں پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا چہرہ لالہ فام تھا!

اور لباس پر سے دل کی دھڑکن عیاں ۔ اندر کی دنیا سنگ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں برف میں ڈوبے ہوئے تھے!۔

یا اللہ!۔ اس نے خود سے ہار کر دیوار سے سر ٹیک دیا: "یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرے لئے وہ نئے تو نہیں!۔ اگر ان کے سامنے ایسی حالت ہو گئی۔ تو۔ تو وہ کیا سمجھیں گے ؟"

اس نے اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں میں جلتے ہوئے رخسار لے لئے! اور آنکھیں بند کر لیں!۔

یونیورسٹی سے شہزاد کی کوٹھی تک پہونچنے میں جگ بیت گئے!!"

ہمیشہ کی طرح یہاں سناٹا تھا!۔ چاروں طرف ہو کا عالم۔ جیسے وہاں انسانوں کی آبادی نہ تھی، روحوں کا بسیرا تھا!!

ارے۔ آفریں بی بی۔ آپ! شہزاد کا ملازم اسے دیکھ کر اُچھل پڑا۔ آئیے آئیے۔ سرکار۔ پڑھنے کے کمرے میں ہیں۔ آپ چلی جائیں گی۔ یا میں انھیں اطلاع پہونچا دوں؟"

میں ڈیڈی کی خیریت معلوم کرنے آئی ہوں۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

اُف خُود۔ ان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی" ملازم نے بتایا:" اب ذرا ٹھیک ہے...!!"

وہ جاگ رہے ہیں کہ ——؟"

جی ہاں جی ہاں۔ جاگ رہے ہیں!"

مجھے ان کے پاس لے چلو۔

بہت اچھا۔ آئیے۔ مگر کیا چھوٹے سرکار کو آپ کی آمد کی اطلاع نہ

دوں ؟!"

"دے دینا۔ میری آمد کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔"

ملازم اسے ڈیڈی کے کمرے میں چھوڑ گیا!۔ وہ اپنے بستر پر اونچے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ اور پہلے سے بدتر لگ رہے تھے۔ چہرہ زیادہ خشک لگ رہا تھا!۔ آنکھیں حلقوں میں اتر گئی تھیں بر بل دبا تھا۔ ان کے پہلو میں بہت سے انگریزی اخبار اور پرچے رکھے ہوئے تھے جنھیں پڑھنے کی بجائے وہ سامنے والی دیوار کو گھور رہے تھے۔

آفریں کو انھوں نے نہیں دیکھا جب تک کہ اس نے پاس پہونچکر انھیں سلام نہ کیا!۔

"جیتی رہو۔ بیٹی جیتی رہو" وہ اچانک چونک پڑے۔ اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے "تت۔ تم۔ آفریں بیٹی ہو نا۔ بیٹھو بیٹھو۔ بڑی کم نے۔ تم نے دوبارہ خبر ہی نہ لی!!"

وہ ان کے پہلو میں ٹک گئی۔ اور اپنے گھر کے حالات انھیں سنانے لگی۔ پھر ان کی خیریت پوچھی۔ بڑے میاں نے بے حد کرب آمیز لہجہ میں شدت سے ہکلاتے ہوئے کہا "موت آئی تھی۔ زندگی کا پرسہ دے کر چلی گئی۔ پھر جانے کب آئے گی" وہ جیسے منہ بنا کر رو پڑے "زمین کا بوجھ ہوں۔ بٹیا۔ اپنے بچے کے لئے عذاب، جنھیں دنیا میں رہنا ہے۔ وہ مجھے جا رہے ہیں۔ اور جس کی ضرورت دنیا کو نہیں ہے، وہ بے مصرف سانس لئے جا رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ بیٹے مجھے زہر دے دے۔ اپنا خون میں نے تجھے معاف کیا۔ مگر وہ نا سمجھ نہیں سنتا۔ نہیں مانتا۔"

"روئیے نہیں ڈیڈی۔ روئیے نہیں۔ آپ کی طبیعت اور بگڑے گی!"
"کیسے نہ روؤں بچی!" وہ آہیں بھر کے بولے۔ "اب تو اپنے سے زیادہ مجھے ضرار کی حالت پر ترس آتا ہے۔ بی بی۔ وہ ساری ساری رات سوتا نہیں۔ اسے اپنے کھانے پینے کی پرواہ نہیں رہی۔ اپنا آرام چین مجھ بڈھے کے پیچھے تج رہا ہے۔ کیا ملے گا اسے۔ ایک بیمار اپاہج کو چند سانسیں نصیب ہو جائیں گی تو اس کا کون سا بھلا ہو جائے گا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے پیچھے وہ خدانخواستہ بیمار ـــــــ!"
"ڈیڈی۔ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ کون آگیا ہے آپ کے پاس!"
دفعتہً دروازے پر ضرار کی بھاری آواز گونجی۔ ایک آہنگ سا آفریں کے دل سے ٹکرا کر تھم گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پردہ ہٹا کر ضرار نے کمرے میں قدم رکھے۔
"آج میری بیٹی آئی ہے مجھ سے ملنے!" بڑے میاں نے خوش ہو کر کہا۔
"آداب!" آفریں نے کانپتا ہوا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا۔
"آداب!!" وہ مسکرایا۔ پھر کرسی کی طرف اشارہ کر کے خود اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں آفریں بیٹھی تھی اور بچوں کے سے لہجے میں باپ سے بولا۔ "ڈیڈی میں نے سن لیا۔ آپ اپنی بیٹی سے میری شکایتیں کر رہے تھے!"

بڑے میاں ہنسنے لگے۔ اس شریر بچے کی طرح جس کی کوئی بے ضرر شرارت پکڑی گئی ہو! ہنستے ہنستے ان کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں جزا ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور آفریں بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔ ان

دولت مند فقیروں کی جھولی میں خوشی نام کی بھیک کتنی تھوڑی سی ہے! بدنصیب ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر وہ ضبط نہ کرتی تو ان کی ہنسی پر رونے لگتی!۔

کچھ دیر اور دونوں باپ بیٹے بالکل بچکانہ باتیں کرتے رہے پھر ان کا فیملی ڈاکٹر آیا۔ اس نے دیکھ بھال کے بڑے میاں کے انجکشن لگایا اور فراز سے بولا۔

"مسٹر فراز! اب انھیں آرام کرنے دیجئے۔ پلیز! آپ باہر جا کے باتیں کریں" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ایک نگاہ آفریں پر بھی ڈالی۔

فراز چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے آفریں بھی چلی آئی۔

"آئیے ادھر برآمدے میں بیٹھیں نہ" اس نے آفریں سے کہا۔ اور ملازم کو آواز دے کر چائے منگوائی۔

اپنی نشست سنبھالتے ہی آفریں بولی "آپ شاید ڈیڈی ہی کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں آسکے تھے!"

"ہاں یہ بات بھی تھی اور" اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا اور پھر رک کر سگریٹ سلگانے لگا۔ تب آفریں نے دیکھا۔ وہ خود سے کتنا لاپرواہ اور بیزار سا ہو رہا تھا۔ گھنی گھنی ڈرا دینے والی مونچھیں۔ کانوں پر پھیلی بڑی داڑھی۔ ایک معمولی سا سوتی لباس۔ اور زندگی کی سرحد سے اتر کر گردن کو چھونے والے بال!۔ "انھیں کیا ہو گیا ہے؟" اس نے سوچا۔

پھر اس نے ایک کش لے کر ہلکا سا دھواں بکھیر اور لاپرواہ بیٹھ گیا۔ ایک ایک رکھتے ہوا اور اس کے شانے پر ایک دو دستک ہر بار زرد[illegible]

"اگر نہیں آتا تو میرا دل ہی نہیں لگتا۔ بس اسی لیے نہیں آیا تھا!"

"آپ کا دوست۔ میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا!"

"ہاں۔ تم اس سے واقف نہیں ہو۔ شاید!"

"میں نے سوچا تھا کہ۔ آپ یونیورسٹی میں، مطلب یہ کہ۔ میں نے ایک مشکل میں آپ کو جو ڈال دیا تھا وہ۔ اب تو اس بدتمیز کی ہمت اور کھلتی جا رہی ہے؟"

"واقعی؟؟!"

"جی ہاں!!۔ وہ زیادتی ہو گئی۔"

"نئی حرکت کیا کی اس نے؟"

آفرین اپنی بپتا سنانے چلی تھی کہ ملازم چائے لے آیا۔

"تم جاؤ۔ ہم بنا لیں گی۔" شہزاد نے ملازم سے کہا۔ اس کے جانے کے بعد آفرین اسے بولا! "اس وقت اپنے ذہن پر زور مت کرنا۔" وہ خفیف سا ہنس دیا۔ "پلیز۔ اب بتا دو۔ میرے سر میں بہت شدت سے درد ہو رہا ہے۔ مسلسل چار دنوں سے یہ اذیت برداشت کر رہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید رگیں پھٹ جائیں گی!"

"یہی تو ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ آپ کئی راتوں سے جاگ رہے ہیں!"
آفرین آگے بڑھ کر چائے بنانے لگی۔ اس کا دل رحم و محبت کے جذبوں سے لبریز ہونے لگا۔ "کوئی درد سر ٹیبلیٹ نہیں لی آپ نے؟"

"یہ دوا سے دور ہونے والا درد نہیں ہے آفرین!"

"تو پھر کیسے جائے گا؟" اس نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے عجیب والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا: "تم آگئی ہو، خوبصورت باتیں کرو گی۔ چلا جائے گا!"

"لیکن میں تو آپ کا درد بڑھانے کی باتیں لے کے آئی ہوں۔" وہ محجوب ہو گئی۔

"وہ بھی میرے درد کا درماں بن سکتی ہیں۔"

"اُف۔" گلابی ہو کر آفریں اپنی پیالی پر جھک گئی۔ اپنی چائے ختم کر کے اس نے کپ پھر آفریں کے سامنے سرکا دیا: "ایک پیالی اور۔"

اس نے ایک بار پھر کپ لبریز کر دیا۔

"سرکار۔" دفعتاً ملازم نے دخل دیا: "آپ نے رات کا کھانا نہیں کھایا، صبح کو ناشتہ نہیں کیا۔ آپ مسلسل چائے پیا رہے ہیں۔ حضور! اگر حکم دیجئے تو میں ناشتہ لے آؤں۔"

"یہ کیا ہے؟" آفریں نے سر اٹھایا۔ "آپ نے ناشتہ کیوں نہیں کیا؟"

"شاید مجھے بھی بخار ہے۔ دیکھو!" اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، مگر آفریں کی جھینپی شکل دیکھ کر اسے ہنسی آگئی: "میں تو بھول گیا تھا کہ تمہیں مذاق کرنے سے عار ہے۔"

لیکن جانے کیوں اس وقت آفریں بے ضبط ہو گئی۔ اس نے شہزاد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جیسے آتش بازی کے گل اس کے بدن کے اندر چھوٹنے لگے۔ شہزاد کی آنکھوں سے حیرت جھانک رہی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا، اور ملازم کی طرف دیکھا تھا وہ وہاں سے چلا گیا۔

آفریں خود کو نارمل کرنے کے لئے اٹھ گئی "مجھے پتہ ہے آپ کا کچن کہاں ہے۔ میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔ میرے آنے تک آپ سگریٹ نہیں پئیں گے"

"تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ایک، آدھ گھنٹہ بعد لنچ کا وقت آجائے گا۔ ہم ساتھ ہی دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ کیا خیال ہے"

آفریں راضی ہو گئی مگر میز پر پڑا ہوا اس کا لبالب سگریٹ کیس اپنی گود میں رکھ لیا اور شہزاد کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔

"ہاں بھئی۔ کیا بات ہے" شہزاد نے پوچھا "تو صاحب، یا عرشیہ، برکہ اب کوئی ملنے نہیں آتا۔ کبھی کبھار اظہار میاں راستے میں مل جاتے ہیں۔ بہت مصروف ہیں یہ سب حضرات!"

جواب میں آفریں نے تفصیل سنائی!

"بہت تنگ کرتا تھا اظہار، بے چاری برکہ کو" شہزاد مسکرایا "شادی کے بعد ناک میں دم کر دے گا۔ ڈاکٹر صاحب اس رشتہ پر راضی ہو گئے؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ تو دادی اماں کی تجویز تھی"

"اچھا اچھا!"

آفریں کچھ سوچنے لگی۔ کس پیرایہ میں وہ اس سے کہے گی۔ اور کیا کہے گی؟"

"کیا سوچ رہی ہو آفریں... تم شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں"

ہاں! وہ کشمکش میں تھی۔

"ارے ہاں،" شہزاد نے چونک کر کہا: "میں نے ان گمنام صاحب کے تمام خطوط شروع سے آخر تک پڑھے تھے۔ میں تو کسی نتیجہ پر نہیں پہونچا۔ اگر کوئی شخص۔ تم سے محبت۔ مطلب یہ کہ۔ اسے تمہاری ذات سے کسی قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تو وہ آخر سامنے کیوں نہیں آتا۔ براہ راست شرافت سے وہ تمہارا ہاتھ مانگے۔"

"یہی کہتے کہتے تو میں رک جاتی تھی۔" آفریں سرخ ہو کر بولی: "ابھی اس بدمعاش نے کپڑوں کا بڑا سا پارسل بھجوا دیا ہے۔ اسے اظہار نے سب کے سامنے کھولا تھا۔ ابھی اس نے اپنا نام فینی لکھا ہے۔ لیکن میں رسم الخط تو ہزاروں میں پہچانتی ہوں۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا ہے۔ میرا کیا انجام ہوگا۔ آپ اس کے لئے ضرور کچھ کیجئے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا۔ ابا جان اور امی مجھے گھر بٹھا لیں گے۔ میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی!"

شہزاد نے دھیرے سے پوچھا: "میں اس گمنام کا پتہ چلا لوں تو تمہیں اس سے ملوا دوں گا۔ آفریں! تم خود اس کی سزا تجویز کر لینا۔"

"نہیں، کبھی نہیں۔" آفریں نے بیحد ناگواری سے کہا: "میں نہ تو اس بدنہاد کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہ میں اس سے کوئی بات کروں گی۔ مجھے اس کے تصور سے کراہیت ہوتی ہے۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ اسے سزا آپ ہی دیجئے۔ اس سے کہئے کہ اگر کوئی اتنی نازیبا حرکت اس کی بہن سے کرتا تو اس کے محسوسات کیا ہوتے؟!"

"میں کہہ دوں گا۔ آفریں۔ تم خواہ مخواہ اپنی طبیعت مت خراب کرو۔"

"آپ نے اس سے محبت کیوں نہ کر لی ؟" بھولپن سے آفریں بولی۔

ضرار کو ہنسی آگئی "ابھی اسی لب ولہجہ میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ نے ناشتہ کیوں نہیں کیا؟۔ آفریں۔ محبت وہ چیز نہیں جسے آدمی خود سے اختیار کرے!۔ تم سمجھیں؟!" وہ مسکرانے لگا "اور اب تم بھی یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں اتنا جانور ہوں کہ محبت سے ناآشنا ہوں بس۔ مجھے وقار و شرافت سے گرے ہوئے اظہار محبت کے طریقوں سے نفرت ہے۔ کتنی واہیات حرکت ہے۔ رونا چلانا، آہیں بھرنا، گریبان چاک کرنا، جیتے جی مر جانا، اور باور کرانا کہ ہم محبت کر رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ آفریں۔ یہ جذبہ ایک خلش ہے۔ ایک چبھن ہے۔ ایک غم ہے۔ ایک بے چینی ہے۔ زندگی کی رعنائی۔ زندگی کی دلکشی۔ لیکن جس کی تقدیر میں بس ناکامی ہے اور انجام موت۔ زندگی بھر تپش غم کی لذت برداشت کرنا۔ اور آخر میں چپکے سے بستر مرگ پر لیٹ کے موت کا انتظار کرنا کتنا دلکش تصور ہے!"

آفریں اسے حیرت و خوف سے تک رہی تھی! وہ کہاں تھا؟ کس سے مخاطب تھا۔ کس ماحول میں تھا۔ جیسے ضرار کو خود بھی اندازہ نہ تھا۔ وہ اس کے چہرے کے آر پار کہیں اور دیکھ رہا تھا! بڑی دور۔ شاید خلا میں اپنے خیال کو کمیں کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے الفاظ کے بامعنی ہونے کا بھی احساس نہ تھا۔ وہ خواب میں بول رہا تھا۔

اور آج سے پہلے آفریں نے اسے اتنا بے ضبط دیکھا بھی نہ تھا! پھر وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ دیر تک آفریں کو تکتا رہا اس کے بعد

خالی الذہنی کے انداز میں پوچھا۔

"میں ابھی کیا کہہ رہا تھا؟"

آفریں ابھی کسی اور کیفیت میں گم تھی۔ یہ آخر کہہ کیوں نہیں دیتے کہ آفریں مجھے تم سے محبت ہے! کیا ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟ تب وہ شاید ضبط نہ کر سکے۔ اس موقعہ پر غیر ارادی طور پر وہ جو کچھ کہے گی جو کچھ کر گزرے گی۔ وہ گناہ نہیں کہلایا جا سکتا۔

کیسا کمزور سا فلسفہ ہے۔ ایک مکمل مرد۔۔ اس سے کہہ رہا ہے۔ محبت صرف زبانی ہوتی ہے۔ جو آنکھوں سے ظاہر ہو سلوک سے بولے۔ مجھے اور وہ آنکھوں کی زبان جانتا ہی نہیں!۔

اس وقت اُن گنت ناتمام جذبوں نے اسے مجبور کرنا شروع کیا۔ پھر اس پر مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔ اور ایک دھند اس کے اطراف ہالہ بنانے لگی۔!

"کبھی کبھی لٹ جانے کی تمنا کتنی شدید ہو جاتی ہے۔"

دفعتاً کسی نے کال بل پورے آواز سے بجا دی! ساتھ ہی ملازم نے برآمدے میں جھانکا۔

"سرکار۔ امپوریم کے منیجر صاحب آئے ہیں۔"

"انھیں وہیں بٹھاؤ"۔ فرازؔ عجیب سی بدحواسی سے بولا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔ "انھیں ادھر ہی مار دو!"

باہر سے دو ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ دوسری آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی! لیکن اس نے کچھ دھیان نہیں دیا۔

برکہ نے آفریں کو بتایا: "آج چچی بی کے داماد آنے والے ہیں!"
"پاگل!" آفریں نے تیوریاں بدلیں۔
"ہاں۔ شام تک عزیزہ پھوپھی، ان کے میاں اور سفیان صاحب آنے والے ہیں۔"
"کیا بک رہی ہو!"
"ایک دفعہ میں نے سفیان بھائی کو دیکھا تھا۔ شاید چھوٹے بھیا سے کوئی کتاب لینے آئے تھے۔ بیحد ہینڈسم آدمی ہیں! سنا ہے کہ تم سے ان کی نسبت پکی ہو جائے گی!"
آفریں سہم گئی۔ گھر کی فضا سنجیدگی سے معمور تھی! ہو سکتا ہے کہ یہ حادثہ ہو ہی جائے!۔ او مالک۔ رحم۔ رحم۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کے لوح دماغ پر ایک قد آور پیکر آہستہ آہستہ اُبھرا اور تھم گیا۔
"فراز۔ تمھیں سچ مچ مجھ سے محبت نہیں؟" وہ سسکیاں لینے لگی۔
"میں کتنے بہانوں سے تمھارے پاس آئی۔ کتنی مرتبہ چھیڑ چھیڑ کر تم سے فلسفۂ محبت پر بحث کی۔ تم تب بھی کہہ سکتے تھے۔ آفریں۔ میں تجھے چاہتا ہوں۔ آہ۔ میں تمھارے قدموں پہ سر رکھ دیتی۔ تمھیں اپنے سفینۂ حیات کا ناخدا مان لیتی۔ تم سے دائمی وابستگی مجھے سچ مچ کامرانیوں کے عرش پر پہونچا دیتی۔ فراز۔ خدا سے تم کو مانگنے کے بعد میں اس سے اور کچھ کبھی نہ مانگتی۔ مگر۔ تم کتنے پتھر ہو۔ تم اندھے ہو۔ تم بہرے ہو۔ تم انسانی جذبات سے بے بہرہ ہو۔ تم نے کبھی میرے دل میں جھانکا۔ سب نہیں دیکھا تم نے میری آنکھوں۔ میرا پیغام نہیں پڑھا۔ نہ تم نے میری باتیں

سمجھنے کی کوشش کی شہزاد۔ سچ سچ تمھیں ہماری صنف سے نفرت ہے۔ ورنہ تم مجھے بھائی جان سے مانگ لیتے تو کون تھا جو تمھیں روک دیتا۔

شہزاد۔ اب بھی سویرا ہے۔ تھام لو میرا ہاتھ۔ بلا لو مجھے اپنے پاس۔

لیکن تم شاید اس طبقاتی فرق کو بہت محسوس کرتے ہو۔ تم دولت مند ہو۔ تمھارے پاس وہ ساری چیزیں ہیں۔ جن کی آج کل کی دنیا دیوانی ہے۔ بنگلہ۔ کار۔ ملازم۔ اور وہ تمام آسائشیں۔ دولت جنھیں آسانی سے فراہم کر سکتی ہے۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کرائے کا معمولی سا گھر، میں ایک گمنام سے معلم کی بیٹی ہوں۔ جو ساری زندگی اپنا علم مختلف لوگوں کو بانٹتا رہا۔ اور نہ اپنے اور اپنے کنبہ کے مستقبل کے لئے کچھ جوڑ کر رکھ سکا۔ میری کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ تم مجھے اپنا کے معاشرے میں سبک اور خفیف ہونا نہیں چاہتے۔ تم اپنے ٹکر کا جوڑ تلاش کروگے۔ اور تب جب تمھارا عیش فراواں کا دور ہوگا۔ تمھیں مفلس و درماندہ آفریں یاد نہیں آئے گی۔ آفریں بدنصیب تمھاری محبت کی روشنی اپنے نہاں خانۂ دل میں جلائے کسی کی زندگی کی راہوں پر اجالا بکھیرنے چلی گئی۔

شہزاد۔ تم آفریں کو کبھی یاد نہیں کروگے۔ کبھی نہیں!!

وہ سوچتے سوچتے رو پڑتی ہے۔

آفریں۔ دس بج چکے منصور میاں بار بار بے چینی سے باہر دیکھ رہے ہیں ابھی تک نہیں آئے شہزاد۔

اس ماحول میں رومانی اچھا ہے۔ عطر کی خوشبو ہے۔ وہ اٹھی۔

وہ بے حد مہذب انداز میں مسکرایا: "پھر بھی۔ ہماری خاطر آپ بولنے کی کوشش ضرور کیجیے!"

"دیکھیے۔ میں سوچوں گی۔"

"اوہو۔ محترمہ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!" وہ خوش ہو گیا! "بہر حال بھولیے گا نہیں!"

وہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ کون تھا۔ ایک بہت خوش رُو، تعلیم یافتہ اور مہذب سا یہ لڑکا۔ کہیں اسے دیکھا نہیں؟ اُف خدا۔ افسانہ، بس باتیں کرنے کا بہانہ۔ وہ ایڈیٹرز روم میں واپس آ گئی اور کرسی پر بیٹھ کر پرس کے نیچے سے کتاب کھینچی۔ اسے اپنا پرس وزنی لگا! اس کے اندر پانچ دس روپے اور ایک ننھے سے رومال کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ تو پھر ـــــ اس نے پرس اٹھا کر جلدی سے اس کی زپ کھینچی! اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کا پرس بڑے نوٹوں سے منہ تک بھرا ہوا تھا!۔ اس نے فوراً زپ بند کر دی۔

یک بیک اس کے ذہن میں آندھی چلنے لگی۔ اوہ سمجھ آیا۔ تو اسے راستے میں روکنے کی وجہ یہی تھی کہ ایڈیٹرز روم میں جا کے اس کا پرس بھرا جائے۔ تو وہ شریف اور مہذب نظر آنے والا غیر شناسا لڑکا بھی یقیناً وہی ہوگا۔ جو اسے ہمیشہ خط لکھتا، اپنی محبت جتاتا اور تحفے دیتا ہے!"

اس کی سانسیں شدت سے پھول رہی تھیں۔ ضبط کی کوشش میں اس کی پسلیاں ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ وہ بگولے کی طرح باہر نکلی۔ راہداریوں

میں مکمل سناٹا تھا۔ وہ اس رُخ پہ دوڑی۔ جدھر وہ لڑکا گیا تھا۔ لیکن اب وہاں کیا تھا؟۔ دور و نزدیک ہر طرف سناٹا۔! سامنے سے دو لڑکیاں ہنستی بولتی چلی آرہی تھیں!۔ اس نے دل تھام لیا۔

"ہیلو۔ آفریں۔ کیا بات ہے۔ کافی اَپ سیٹ نظر آرہی ہو" ایک لڑکی نے پوچھا۔ وہ ایم۔ اے کی طالب علم تھی۔

"آپ نے ادھر سے ایک لڑکے کو جاتے دیکھا؟" چھوٹتے ہی آفریں نے پوچھا۔

"لڑکے کو" وہ بیساختہ ہنس دی "ڈارلنگ وہ پاؤں پاؤں گیا کہ آیا کی گود میں؟"

دونوں سخت لوفروں کے انداز میں ہنس دیں۔ آفریں کو غصہ آگیا۔

"لڑکے تو آتے ہی جاتے رہتے ہیں۔ کوئی خاص پہچان بتاؤ!"

"جی نہیں۔ شکریہ!" وہ بھناگئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ قدرے ہوش میں آئی تو پرس دبوچ کر سیدھی ٹوائیلٹ روم میں آئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اکڑوں بیٹھ کر پرس فرش پر الٹ دیا۔

"ایک بنڈل میں پانچ ہزار۔ اور یہ چار بنڈل تھے!"

اس نے ایک طویل سانس لی "یہی سہی۔ تم کوئی جاگیردار معلوم ہوتے ہو۔ اس نے حقارت سے دانت پیسے۔ مگر تم چوہے کے بچے سے بھی بدتر ہو۔ بکری کی اولاد سے بھی بدتر۔ تم بزدل ہو۔ ایک لڑکی۔

آفرین کی نظروں میں بیس ہزار کے بنڈل گھومنے لگے! یا معبودِ برحق! ان کا کیا کروں؟ کیسے سب کو باور آئے گا کہ کسی نے پرس میں زبردستی رکھ دئے ہیں! نجانے کیا کچھ شک کیا جائے اس پر۔ تب تو وہ قطعی زہر کھالے گی۔ چچا جان کی الماری میں کئی شیشیاں ایسی رکھی ہیں۔ جن پر لفظ زہر تحریر ہے!

"کب آئیں گے۔ کمال میاں اپنے بھائی کو لے کر!" امی نے پوچھا۔

"بھابی۔ کیا واقعی یہ بر دکھوا ہے؟" الطاف صاحب نے کہا۔

"میں تو کمال میاں کی والدہ سے سب کچھ آج ہی طے کر لوں گی" دادی اماں کی آواز سنائی دی۔ "الطاف۔ میاں تم نے اظہار کی نسبت کچھ نہیں کہا؟"

"میرا دماغ کام نہیں کرتا اماں بی۔ آپ اگر مناسب سمجھئے تو میجر صاحب سے کہہ دیکھئے!" الطاف صاحب نے جواب دیا۔

"اے ہو۔ میں اپنی طرف سے کیوں کہنے لگی" دادی اماں بولیں "یہ تو افتخار میاں کے کہنے کی بات ہے۔ ان سے تم نے خواہ مخواہ کا بیر ایسا باندھا ہے کہ مرنے جینے میں بھی نہیں ملتے۔ وہ بھلا تمھاری لڑکی سے پیام کیسے دینے لگے۔ دل میں سمجھتے ہیں کہ تم فوراً انکار کر دو گے!"

"اب نہیں کروں گا انکار" الطاف صاحب نے ہولے سے کہا۔ "ان کا لڑکا کرتا کیا ہے؟"

"ایم۔ ایس۔ سی کر رہا ہے!" عزیزہ پھوپھی نے جواب دیا۔

"ارے ہاں۔ عزیزہ۔ تم کبھی ہاجرہ کے کان میں بات ڈالنا" دادی اماں

نے کہا۔

اتنے میں توصیف اور تعظیم بھی باہر سے آگئے!۔

امی۔ ادر دادی اماں۔ بجتی آپ لوگوں کو ابھی، ورا اسی وقت ضرار صاحب کے یہاں جانا ہے: توصیف نے کہا: "مجھے دوپہر کو انھوں نے بینک میں ملازم کو بھیج کر بلوایا تھا۔ ان کے والد کی حالت بہت خراب ہے۔ بے چارے پر دشنے وقفے سے دورے پڑ رہے ہیں! ضرار صاحب اکیلے ہیں۔ ہمارا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔"

مگر یہاں تو کچھ دیر بعد کمال میاں آرہے ہیں بھائی کو لے کر "امی گھبرا کر بولیں۔ تعظیم احمد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے وہ بہایت سخت گیر اور غصہ ور تھے۔ انھوں نے کہا: "یہ رسم اتنی ضروری نہیں ہے۔ ملازم کو بھجوا دیجئے کہ آج وہ حضرات تشریف نہ لائیں۔ میں ابھی بھیا کے ساتھ ضرار صاحب کے گھر گیا تھا۔ وہ سخت پریشان ہیں۔ آپ سب ان سے واقف ہیں، ان کی دلداری کے لئے وہاں جانا بہت ضروری ہے!"

میں اور تعظیم وہیں جا رہے ہیں۔ آپ لوگ فوراً آئیے" دونوں پھر گھر سے نکل گئے۔ اور تعظیم نے ملازم کو پیغام دے کر عزیزہ پھوپھی کی سسرال کی طرف روانہ کر دیا۔

یہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حتی کہ اپنی اہم پوزیشن اور پینشے کا احساس کر کے ڈاکٹر الطاف احمد بھی جانے کے لئے مستعد ہو گئے!۔

"بہت اچھا لڑکا ہے۔ کاش اس سے اپنی آفریں کی ـــــ" دادی اماں کچھ کہنے چلی تھیں کہ امی نے بات کاٹ دی۔

"اے اماں بی چپ رہیئے۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ ان کے والد کو صحت و زندگی دے!" پھر انہوں نے آواز دبا کے کہا: "جب ضرار ہی کچھ توجہ نہیں کرتے تو ہم اپنی طرف سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔ وہ امیر کبیر آدمی ہیں ان کے لیے دولت مند لڑکیوں کا کیا کمی ہے۔ آئیے! شاید غفور میاں رکشہ لے آئے!"

ضرار کے والد کو ان کے کمرے سے بڑے دالان میں لایا گیا تھا۔ اب وہاں انسانوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔

متعدد ڈاکٹر اور سرجن ان کے اطراف موجود تھے۔

آفریں بھی ان ہمدردوں میں کھڑی کپکپا رہی تھی۔ جو فی الحال بالکل بے بس تھے۔ اس نے انسانی جسموں میں خفیف سی دراڑ پڑتے دیکھ کر اندر نظر ڈالی۔

اسے ضرار دکھائی دیا۔ باپ کے پلنگ کی پٹی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا وہ ان کے ہاتھ پر سر رکھے سسک رہا تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اتنی تیز جھنجھلاہٹ اور سرگوشیوں میں سن نہ سکی۔

اب کوئی امید نہیں۔ وہ بے چارے بستر زندگی کے بس کا کسی نے کہا۔ سنتے وہ ہجوم پیچھے ہٹا۔ اور ڈاکٹر بھی سیدھے کھڑے ہو گئے۔

صرف ڈاکٹر الطاف اور ضرار کا فیملی ڈاکٹر پاس رہ گئے تھے! تب آفریں نے دیکھا۔ بے چارے بیمار کی صورت پر عجیب سی زردی جم گئی تھی۔ ان کی آنکھیں نیم وا تھیں اور لب کانپ رہے تھے۔ گھر کا پرانا خدمت گار ان کے سرہانے بیٹھا پنج سورہ پڑھ رہا تھا اور تو مینٹ ان پر جھکے ہوئے ان کے

رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا!۔

میل زمن نے جو برسوں سے ضرار کے والد کی خدمت پر مامور تھا۔ چیکے چیکے اوصاف صاحب وغیرہ کو بتایا۔ پچھلی رات ہی سے وہ کچھ عجیب انداز سے ہاتھ اوپر تان رہے تھے۔ ان کی ٹانگوں میں جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ اس نے مٹا فیملی ڈاکٹر کو بلایا۔ جس نے کہا تھا کہ ان پر اچانک دورے پڑنے لگے تھے۔ اس مرض میں عموماً یہ صورت حال ہو جاتی ہے۔ اور اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔

اور واقعی کوئی توقع باقی نہ تھی!۔

رات کے تقریباً تین بجے روح و جسم کی کشمکش ختم ہو گئی! بیمار کو ابدی آرام مل گیا۔

وہ سب دالان میں سرنگوں بیٹھے تھے!۔

سناٹے میں کبھی کبھار ضرار کی بھاری آہیں گونج اٹھتیں۔

پھر وہ دادی اماں کی صبر کی تلقین پر بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

"بڑے صبر و ایثار کی زندگی تھی میرے ڈیڈی کی۔ امی کے بعد وہ اگر چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے۔ لیکن مجھ بدنصیب کی محبت نے گوارہ نہ کیا کہ وہ مجھ پر سوتیلی ماں لائیں۔ ان کی محبت کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔ میں نے ان کی محبت نہیں پہچانی۔ ان کی کوئی بات نہیں مانی۔ ۔ انھیں کتنی تمنا تھی وہ میری شادی کر دیں۔ جب سے بے چارے مجبور ہو کے ایک جگہ آ بیٹھے تھے۔ آہ۔ ان کی زبان پر بس یہی ایک وظیفہ تھا۔ کاش ضرار تم شادی کر لیتے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے وہ ادھر ادھر سے کھیلتے ہوئے آتے

اور میری گود میں گر پڑتے۔ مجھے اپنی محرومی کا بدل مل جاتا۔ میں اپنی معذوری بھول جاتا! آہ۔ میں نے ان کی تمنا کو کوئی وقعت نہ دی۔ میں یہی سمجھتا رہا۔ میرے ڈیڈی ابھی بہت جئیں گے۔ موت ان کے لئے نہیں بنی ہے۔ ورنہ۔ کیا میں ان کی خوشی پوری نہ کر دیتا؟"

اس نے آنسوؤں، ہچکیوں اور آہوں میں جب اپنا نوحہ ختم کیا تو سب کو رُلا دیا!۔ عجیب وحشت انگیز سوگوار ماحول تھا!۔ دالان میں اکا دکا تیز بلب روشن تھے۔ عود دو بان اور اگربتیوں کی بھیانک خوشبو فضا میں چکرا رہی تھی۔ سامنے پلنگ پر لاش چادر سے ڈھکی پڑی اور دیکھنے والوں کے دلوں میں ہیبت و خوف کے اثرات پیدا کر رہی تھی!۔

کھلے دریچوں کے باہر رات کے تاریک قدم آہستہ آہستہ منزل نور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آسمان پر صبح کاذب کی سفیدی ایک دبیز لکیر کی مانند سیاہ آسمان پر اُبھر آئی تھی!۔ صبح کی پیغامبر ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اور کہیں دور سڑک پر خلقت کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی!۔

خدا خدا کر کے موت کے گھر میں ایک سرد و سوگوار صبح نمودار ہوئی! توصیف نے تھکے ماندے پریشان حال ضرار سے رُکتے رُکتے کہا: "کچھ دل قابو میں کر دو میرے بھائی۔ اس طرح تو تم خود بیمار ہو جاؤ گے۔ ضرار۔ تم اپنے آپ کو اکیلا تنہا اور بے بس کیوں سمجھتے ہو۔ میرے دوست۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارا بھائی؟ مجھے بھول گئے ہو تم؟!"

"اب تم ہی لوگ سب کچھ ہو۔ توصیف!" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"اگر ظہر کی نماز کے وقت تک۔ مطلب یہ کہ" توصیف نے کہا "اپنے

عزیزوں کو بھی مطلع کر دو۔"

"میرے سب عزیز یہاں موجود ہیں" اس نے جواب دیا۔ اور پھر سر جھکا کر اپنے غمناک خیالوں کے بھنور میں غرق ہو گیا۔

توصیف نے معنی خیز نظروں سے اپنے والدین وغیرہ کی طرف دیکھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا۔ انہی سب کو کرنا تھا۔ شہزاد تو گویا اپنے باپ کے آخری رسوم کی تکمیل سے بھی غافل ہو چکا تھا۔

بہرحال اوصاف صاحب، ڈاکٹر الطاف، توصیف وغیرہ نے اس کے خاندانی ملازم سے ضروری باتیں دریافت کی تھیں۔ ان ہی لوگوں نے آخری رسمیں انجام دی تھیں۔ شہزاد دنیا و مافیہا سے بے خبر جس طرح کرسی پر بیٹھا رہا تھا اسی طرح بیٹھا رہا۔ یوں لگتا تھا۔ بڑے شدید ناقابل تلافی پچھتاوے نے اس پر پوری قوت سے یلغار کر دی تھی۔ اور وہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بھی دفعتاً کھو بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بڑے میاں کو پلنگ پر سے اٹھایا گیا۔ وہ تب بھی خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور اٹھ کر باہر نہیں گیا۔

"بیٹے۔ جاؤ۔ اپنے باپ کی آخری خدمت انجام دو۔ اپنے ہاتھوں انہیں غسل دو" دادی اماں نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا۔ "اس طرح سوچنے سے اب کیا فائدہ۔ اپنی طبیعت قابو میں کرو۔"

"نہیں۔ دادی اماں۔ نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"کہیں ان کے دماغ پر اثر نہ ہو جائے" امی نے چپکے سے عرشیہ سے کہا۔ تینوں لڑکیاں خاموش اور خوف زدہ سی ایک جگہ بیٹھی تھیں۔ عرشیہ اور برکہ کا غم رسمی تھا۔ لیکن آفریں کی عجیب کیفیت تھی۔ شہزاد کا سادہ اعتراف [illegible]

ذات پر سے ہو کر گزر رہا تھا۔ وہ بے بس تھی۔ کچھ کر نہ سکتی تھی۔ ویسے وہ وہ کر امی کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور شہزاد کا سر اپنے سینے سے لگا لے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دے۔ اگر قدرت شہزاد کو ننھا سا بچہ بنا دے تو وہ اسے اپنے کلیجے میں چھپا کر کہیں لے کر بھاگ جائے!۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سب کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

بہت سا وقت گزر گیا۔ اور گھر کے مرد ظہر کے بعد قبرستان سے واپس آئے۔ شہزاد ان سب کے ساتھ نہیں گیا!۔ اسی طرح ہوش و بیہوشی کے سنگم پر دم بخود بیٹھا رہا تھا!۔

"انہیں کیا ہو گیا ہے امی؟" توصیف پر بھی سکتہ سا طاری تھا

"دماغ پر شدید صدمہ ہوا ہے۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں!" امی نے کہا۔

"شہزاد!" توصیف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بڑی معصومیت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے تمہیں۔ کیا سوچ رہے ہو؟" توصیف نے کہا۔ پھر جی کڑا کر کے بولے "تم اپنے ڈیڈی کے جنازے کے ساتھ بھی نہیں گئے ان کو آخری دفعہ دیکھا تک نہیں۔ کیسے ظالم ہو گئے ہو!!"

"ارے میرے بڈھی کے لئے ایسے منحوس الفاظ منہ سے کیوں نکال رہے ہو؟" شہزاد نے کہا۔ پھر گھبرایا "خدا کے لئے ایسی بات نہ کہو۔ وہ بیمار ہیں۔ وہ اگر ایسی بات سن لیں گے تو ان پر بہت خراب اثر پڑے گا!"

"کہاں ہیں تمہارے ڈیڈی؟" توصیف دہشت زدہ تھے۔ شہزاد کا دماغ

اس کے قابو میں نہ تھا!۔

یہیں تو لیٹے تھے ڈیڈی"۔ ضرار نے خالی پلنگ کی طرف دیکھا۔ پھر کرسی پر اس کی نظر پڑی۔ کرسی بھی خالی ہے۔ ڈیڈی کا پلنگ بھی خالی۔ کہاں چلے گئے۔ وہ تو چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اچھا ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔ شاید انھیں کسی نے اندر کمرے میں پہنچا دیا ہے!" اور یہ کہہ کر وہ اٹھا اور لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ ایک لمحہ بعد ضرار کی آواز سنائی دی۔

"ڈیڈی۔ ڈیڈی آپ کہاں ہیں!۔ جواب دیجئے۔ کیا آپ اپنے پیروں سے چلنے لگے ہیں۔ میں آپ سے کہتا تھا کہ مایوس مت ہوئیے۔ ایک دن آپ ضرور چل سکیں گے۔ لیکن آپ نے کبھی یقین نہ کیا۔ مگر۔ آپ کہاں ہیں۔ بولئے ڈیڈی۔ جواب دیجئے۔ آپ اپنے ضرار کی پکار نہیں سن رہے ہیں؟ ڈیڈی۔ پیارے ڈیڈی۔ آواز دیجئے!"

اب تو یہ حال تھا کہ گھر کے سارے ملازمین بھی دالان ہی میں آگئے تھے۔ اور آہ و بکا کا ایک شور سا برپا تھا۔ ضرار پھر باہر آگیا اور ان سب کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے۔ آپ سب لوگ رو کیوں رہے ہیں۔ آپ لوگ کون ہیں؟ یہاں کس لئے آئے ہیں۔؟

ضرار۔ ضرار۔ تم مجھے مار ڈالو گے میرے بھائی!" توصیف رو پڑے۔ "ہوش میں آؤ۔ دل کو قابو میں کرو۔ اتنا زیادہ اثر تم نے لیا ہے!"

ارے بھائی۔ آہستہ بولو" ضرار گڑ گڑایا۔ "ڈیڈی سو رہے ہیں۔ تمھاری

آواز سنیں گے، جاگ پڑیں گے اور ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔!
ہائے یہ کیا ہو گیا؟" توصیف سر تھام کر تخت پر گر پڑے۔ پھر انھوں نے دل کو مضبوط کیا۔ اور ڈاکٹر الطاف کے ہمراہ اسے زبردستی ایک بڑے اسپتال میں لے گئے۔

مشہور اور ماہرینِ دماغ نے ضرار کا معائنہ کیا! ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ ناگہانی صدمہ اور ناقابلِ برداشت غم نے ضرار کے دماغ پر گہرا اثر کیا تھا۔

اب کیا ہو گا جناب!" توصیف ہاتھ مل رہے تھے۔ ڈاکٹروں کا ایک گروپ ضرار کو لے کر کسی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا چکا تھا۔ ڈاکٹر ترما جو دماغی امراض کے ماہر سمجھے جاتے تھے انھوں نے توصیف کو تسلی دی "ہم دیکھتے ہیں۔ ویسے مسٹر توصیف۔ جلد صحت یابی کی توقع کم ہے۔ آپ ہمت سے کام لیجئے!۔

اور ایک دردمند نگاہ ان پر ڈال کر چلے گئے!۔

توصیف نے ضرار سے ملنا چاہا تھا۔ وہ نجانے کب سے بھوکا پیاسا تھا۔ اس پر کیا گزر رہی تھی۔ کچھ پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹروں نے بڑے اخلاق سے توصیف کو رخصت کیا۔ اس ہسپتال میں ڈاکٹر الطاف کے شناسا بھی بہت سے ڈاکٹر دوران کے شاگرد تھے۔ سب نے توصیف کو بہت اطمینان دلایا کہ اب وہ بیمار کو خود دیکھ لیں گے۔

توصیف بحالِ پریشان واپس کوٹھی آئے۔۔

یہاں انھوں نے کسی صاحب کو اپنا منتظر دیکھا!۔

ضرار کے پرانے ملازم نے توصیف سے کہا: "آپ ہیں کرنل اشرف خان!
صاحب! ضرار صاحب کے چچا۔"

توصیف نے ان سے ہاتھ ملایا اور خاموش ہو گئے۔

"آج صبح کے اخبار سے بریگیڈیئر جرار احمد خاں کی وفات کی خبر پڑھی!
بڑا صدمہ ہوا۔ کئی برسوں سے مرحوم نے ہم سے اور خصوصاً اپنے تمام قریبی
عزیزوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔
بہرحال ان کے طیش و برہمی نے انہیں کے تعلقات تو منقطع نہیں کئے! افسوس
افسوس۔ سنا ہے کہ بہت بیمار تھے!۔"

"جی ہاں!"

"ضرار میاں کہاں ہیں؟"

"کیا عرض کروں جناب!" توصیف نے دل گرفتہ انداز میں جواب دیا۔
"ان پر اپنے والد کی وفات کا نہایت ناگوار اور ناقابل برداشت اثر
پڑا ہے وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہ گئے۔ کچھ دیر قبل میں اور میرے
چچا ڈاکٹر اطہر احمد صاحب انہیں مینٹل ہاسپٹل لے گئے تھے۔ ہسپتال
کے بورڈ ڈاکٹروں نے انہیں ٹریٹمنٹ کے لئے روک لیا ہے۔ چونکہ ہمیں ان
کے پاس جانے کی اجازت نہیں ملی۔ اس لئے ہم مجبوراً انہیں تنہا چھوڑ کے
واپس آ گئے۔"

"[illegible] ہے۔ باپ بیٹے نہایت حساس، جذباتی، زود رنج اور تنہا
پسند تھے [illegible] کرنل صاحب [illegible] میں [illegible] کی دعا [illegible]
[illegible] میرے شناسا ہیں۔ میں

توصیف اپنے گھر گئے۔ اور ضرار کی سی شاندار شخصیت کی تباہی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے!!۔

ایسا لگتا تھا کہ کوئی منحوس کالی گھٹا ان سب پر مستقل طور پر چھا گئی تھی۔ اور اس کے چھٹنے کے فی الحال کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے!۔

اوصاف صاحب نے عزیزہ پھوپھی کے دیور سفیان احمد کی نسبت آفریں سے منظور کر لی تھی، ان کے بردکھوے میں اوصاف صاحب نے اپنی بھاوج ہاجرہ بیگم کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ اپنی سابقہ سسرال سے واپس اپنے گھر پہونچیں تو میجر صاحب آ چکے تھے!۔ اور نہایت برہم سے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ ہاجرہ بیگم کا دل دھڑکا۔ وہ چپ چاپ باورچی خانے کی طرف ہو لیں۔

"ٹھہر جاؤ" میجر صاحب اپنے پورے فوجی دبدبے کے ساتھ گرجے۔

وہ رک کر مڑیں!۔ میجر صاحب نے سرد لہجے میں پوچھا: "کس کی اجازت سے وہاں گئی تھیں۔ میں نے تو تمہیں منع کر دیا تھا!"

بھائی صاحب نے بلایا تھا۔ آفریں کی نسبت کے سلسلے میں!!

اور بس۔ میجر صاحب اول فول بکنے لگے۔ ان پر نہایت رکیک بہتان رکھے۔ انھیں ڈاکٹر الطاف کی داشتہ کہا۔ بدچلن بنایا۔ ہاجرہ کے رونے دھونے کی قطعی پرواہ نہ کی۔ جو منہ میں آیا بکتے رہے!۔ بیوی کی کچھ سننے پر تیار نہ تھے۔ اس رات انھوں نے بے چاری کو تار حجر کرنے کے نئے نئے

طریقے آزمائے۔ جسمانی تکلیفیں دیں۔ ذہنی اذیتیں پہونچائیں۔ بالکل دیوانے لگ رہے تھے!۔ جیسے ان کی قلب ماہیت ہو چکی تھی!۔

اظہار بے چارہ حیران دششدر والدین کے کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا اور اپنے باپ کی گرج دار آواز سن رہا تھا۔ صرف آواز۔ طوفان کی سی گھڑ گھڑاہٹ بے معنی۔ بس آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ کمرے میں گھس جاتا

رات کے بارہ بجے ان کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ اور انھوں نے باجرہ بیگم کو باہر ڈھکیل دیا۔ بالکل بھوت معلوم ہو رہے تھے۔

ڈیڈی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"۔ اظہار چیخ کر باجرہ بیگم کی طرف جھپٹا

"خدا کی قسم تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔ اظہار ہٹ جا سامنے سے۔ میں اس طوائف کو اس کے گھر پہونچا کے رہوں گا۔ ذلیل کمینی عورت۔ اب یہ میری وفادار نہیں رہی!۔ پوچھو اس سے یہ اپنے سابقہ شوہر کے گھر کیوں گئی تھی؟" وہ دہاڑ رہے تھے گرج رہے تھے۔ ان کے منہ سے کف جاری تھا۔

ڈیڈی ٹھنڈے دل سے بات سنئے!"۔ اظہار نے باپ کا بازو پکڑ کر الگ ہٹایا۔ "امی کو اوصاف صاحب نے بلایا تھا۔ آفریں کی نسبت ———

پھر وہی کمزور تاویل۔ آفریں کی نسبت سے اس بدبخت کو کیا سروکار ہے!؟"

"دادی اماں آفریں اور برکہ کی شادیاں ساتھ ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔ امی کو میرے سلسلے میں کچھ پوچھنے کے لئے بلایا تھا۔ ڈیڈی۔ امی وہاں ایک

گھنٹہ بھی نہیں ٹھہریں۔ آپ کے خیال سے جلد آ گئیں!"

"وہاں ڈاکٹر صاحب تھے؟" انھوں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "خبردار جھوٹ مت بولنا۔ قرآن سر پر رکھوا دوں گا!"

"تھے۔ ڈیڈی!" اظہار سر جھکا کر بولا۔

"اور اب تم بولو!" وہ دہاڑ کر ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ "جس جگہ تم بیٹھی تھیں۔ وہاں تمھارے سابق شوہر بھی تھے کہ نہیں؟"

ہاجرہ بیگم زمین پر بیٹھی زانوؤں میں سر دیے سسک رہی تھیں! دفعتاً وہ پھر پھٹ پڑے: "نہیں! اب تمھارا نباہ ناممکن ہے۔ میں تم جیسی استعمال کی ہوئی عورت کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتا۔ ہاجرہ میرے گھر سے چلی جاؤ!"

اظہار۔ یہ کیسا ظلم ہے مجھ پر! ہاجرہ بیگم کا دل پھٹ رہا تھا۔ وہ بلبلا اٹھیں: "اظہار میں اپنے مرحوم ماں باپ کی قبر کی قسم کھاتی ہوں۔ میں نے اس آدمی کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کے چلے گئے! یقین مانو۔ بیٹا۔ یہ مجھ پر تہمت ہے۔ بہتان ہے۔ جھوٹ ہے!"

"مجھے جھوٹا بنا رہی ہو۔ میری آنکھوں کو جھٹلا رہی ہو!" بڑے طیش میں میجر صاحب ان کی طرف مڑے!

"بالکل جھوٹ ہے!" ہاجرہ نے کہا۔

"افسوس! ہاجرہ۔ تم نے میرا اعتماد کھو دیا۔ تمھارا جرم کسی جا تا رہا۔ ان دس سال کے طویل عرصہ میں تمھارا دل نہ جیت سکا۔ حالانکہ تم نے اداکاری بہت کی۔ لیکن یہ دل کا معاملہ ہے۔ تمھارے دل پر آج بھی اس

باہر آئے۔ ہاجرہ ان کے سامنے نہیں آئیں۔ میجر صاحب نے اظہار سے کہا۔ "میری الماری میں کچھ رقم اور ضروری کاغذات ہیں۔ ان کا خیال رکھنا!"

"آپ کہاں جا رہے ہیں ڈیڈی؟" اظہار ڈر گیا۔

"سامنے والی سڑک تک۔ ذہن کو سکون پہنچانے جاتا ہوں!" یہ کہہ کر انہوں نے اظہار پر ایک نظر ڈالی! ایک بڑی طویل سانس لی اور تیز تیز قدموں سے نکلتے چلے گئے!

"میرا دل ڈوبا جا رہا ہے اظہار!" ہاجرہ اپنے کمرے سے نکلیں "نہ جانے وہ کس ارادے سے گئے ہیں۔ جلدی جاؤ۔ انہیں واپس لاؤ!"

"بس ڈیڈی کا موڈ آف رہا ہے امی! نہ جانے کیا کہہ دیں۔ وہ خود آ جائیں گے تھوڑی دیر بعد۔ آپ خواہ مخواہ وہم نہ کیجیے۔ چائے … ہاتھ دھو لیجیے کچھ کھا پی لیجیے!"

"اوہ!" وہ آہ بھر کر رہ گئیں اور صحن کی طرف چلی گئیں۔

انتظار ادھورا نہ کیا گیا۔ اب کاہے کا کھانا پینا۔ کاہے کا جینا! شوہر کی نظروں سے گر جانے کے بعد اس گھر میں ان کی جگہ کہاں تھی۔ وہ ان کی نگاہوں کے سامنے اس گھر میں کیونکر رہ سکتی تھیں۔ کالی ساڑی رکھے، کھڑی بس وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ آنسو ان کے زخمی گالوں پر بہہ رہے تھے اور ان میں آگ سی لگا رہے تھے!

اور پھر وہی ہوا۔ جس کا اندیشہ ہاجرہ کو رہا تھا۔ میجر صاحب نے خودکشی کر لی۔ انہوں نے ایک تیز رفتار لاری کے سامنے خود کو گرا دیا۔ لاری ان پر سے گزر گئی۔ اپنی دفعتاً خودکشی کا جواز دے بیٹھے میجر صاحب نے

اپنے پیچھے انہیں چھوڑا۔ سب یہی سوچتے رہے کہ وہ کسی ناگہانی حادثے کا
شکار ہو گئے تھے!۔

انہیں باتنا شریف اور وسیع النظر نکلا کہ اس نے کبھی کوئی نامناسب
بات منہ سے نہ نکالی جس سے اس کی ماں پر حرف آتا۔ اور ہاجرہ بیگم اپنی
نادانی اور دل کی نادانیوں کی بات اپنے منہ سے کیا کہتیں۔ اب وہ شدید
پچھتاووں میں گرفتار تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد ان کی خوبیاں ان پر
کھلیں۔ اگر وہ اتنے روشن خیال، وسیع النظر، اور پرمحبت نہ ہوتے تو خود
ان کے راستے سے ہٹ جانے کی بجائے بیوی کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے
لیکن انہوں نے مر کے ہاجرہ کو ناقابلِ برداشت سزا دی تھی۔ وہ ہنوز ادھر
کی رہی تھیں نہ ادھر کی۔ اپنی نظروں میں آپ سبک و شرمسار وہ خود کو
خود سے چھپاتی پھرتی تھیں!۔ ان کی نامناسب جذباتیت نے ایک شوہر
کی جان لی جو ان پر فدا تھا!۔

اظہار ہی ان کو لینے آیا تھا۔ تب ہاجرہ اظہار کے آگے ہاتھ جوڑ
کر کھڑی ہو گئیں!۔

"اب میری لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ میرے بچے!"

جواب میں اظہار ان ہاتھوں پر جھکا اور بلک بلک کے رو پڑا!۔

سفیان احمد کے والد نے آفریں سے نسبت طے ہو جانے کے بعد مطالبہ

کیا کہ اب لڑکی کو مردانہ کالج نہ بھجوایا جائے!۔ زینب خاتون کی تو شروع ہی سے یہ مرضی تھی۔ اب جلتی پر تیل پڑ گیا۔ انھوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ آفریں کو وہ کالج نہیں بھجوائیں گی!۔

آفریں خود بھی نہ جا سکی۔ اس کے لئے اب وہاں رکھا ہی کیا تھا۔ اس کی تمام دلچسپیاں مردہ ہو گئی تھیں۔ وہ گم صم ہو گئی تھی جس ذات سے اس نے اپنی ذات اپنی زندگی خاموشی سے وابستہ کر دی تھی۔ وہی اس سے بے نیاز اپنی تقدیر بھگت رہی تھی!۔ آفریں کی تمام تمنائیں سو گئیں۔ اس کے منہ بند ارمان سسک اٹھے، اس کی آرزوئیں تمام بستہ ہو گئیں!۔ اس کی قسمت نے بڑی تباہ کن کروٹ لی تھی۔ اس کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا اب وہ بس مرجانے کے لئے جی رہی تھی!۔ خاموشی، ادب، خود داری سے دبی، کچلی آفریں بے زبان ہو کر رہ گئی تھی!۔

دلہا کیا ہوا تول دیا وہ اس کی بے بس مجبور نظر اپنے آس پاس شہزاد کو ڈھونڈتی۔ رات کی تاریک تنہائیوں میں وہ آنسوؤں کی زبان میں اسے پکارتی۔ شہزاد۔ شہزاد۔ آجائیے میرے پاس۔ ایک دفعہ۔ صرف ایک دفعہ۔ میں ایک بار پھر اپنا درد دل آپ سے بیان کر دوں!۔ ہائے آپ اپنے جذبات سے سینے میں مرہم کا دل لئے پھرتے تھے۔ میں نے آپکی جیتے جی جدائی سہہ لی۔ آپ اپنے باپ کا غم برداشت نہ کر سکے!۔ پھر وہ سجدے میں گر جاتی اور تڑپ تڑپ کر دو لہی شہزاد کی صحت کی دعائیں مانگتی!۔ اسے یقین تھا۔ اس کی دعاؤں میں اثر ہو گا۔ شہزاد صحت مند ہو کر گھر چلا آئے گا!۔ اسے امید تھی شہزاد اسے سفیان سے بچا لے گا۔ وہ اس

کے ماں باپ سے اسے مانگ لے گا! ان سے کہے گا۔ آفریں کو مجھے دے دیجئے۔
یہ میری آرزو ہے!۔ لیکن اس کے ہاتھ دعاؤں کے لئے اٹھے رہ گئے۔ اس
کے بے سبب آنسو بہتے رہے۔ اس کی بے شمار تمناؤں کے مدفن اس کے سینے میں
بنتے رہے۔ اس کی روح آہستہ آہستہ جگہ جگہ سے ٹوٹتی رہی!۔ آس نراس
میں دن بیتے۔ ضرار اچھا ہو کے منگل یا سنیچر سے نہیں آیا۔ سفیان سے اس کا
رشتہ طے ہو گیا!۔

توصیف مرشد آباد، بڑکہ وغیرہ کے پے در پے حادثوں سے نالاں اور بہت
دل گرفتہ تھے۔ میر صاحب کا دردناک واقعہ ان کے اپنے خاندان کا تھا۔
اور ضروری نہیں متوقع حادثہ بھی یہ ہو گا، اپنے ہی کسی آدمی کا حادثہ سمجھتے تھے
ضرار کا کوئی نہ تھا۔ جو اس کی فکر کرتا۔ ویسے تو ڈاکٹر الطاف، اپنے رشتہ دار سا
ڈاکٹروں سے اس کی خاص تربیت سے کرنے کو کہتے رہتے تھے۔ وہ کرنل
ارشد کی توجہ کرتے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ علاج اور افاقہ کی رفتار
بہت سست تھی۔ توصیف اپنے دوست کی خبر گیری سے کبھی غافل نہ ہوئے۔
وہ برابر جاتے رہتے تھے۔ اس کے لئے پھل پھول اور ضرورت کی دوسری
چیزیں لے جاتے۔ لیکن ضرار سب سے لاپرواہ تھا۔ اگر نرس اسے کچھ کھانے کو
دیتی تو وہ بلا عذر کھا لیتا۔ اپنی طرف سے کبھی کچھ مانگتا نہ تھا!۔ اس کی حالت
قابل رحم تھی!۔ توصیف اس کے پاس بیٹھ کر روتے تھے۔ اور وہ چپ چاپ
ان کی شکل تکا کرتا!۔

وہ گھر میں اس کا تذکرہ کرتے! اور آہیں بھرتے تھے!۔
ان دنوں گھر پر ایک مستقل اداسی طاری رہتی تھی۔ زینب خاتون کو

آفریں اور برکہ کا ساتھ بیاہ کرنے کا بہت ارمان تھا۔ لیکن ان کی خواہش جب ادھوری ہوئی تو ان کی خوشیاں ملیامیٹ ہو گئیں۔ اب انہیں ایک فرض پورا کرنا تھا!۔

اظہار ختم تعلیم کے بعد اپنے ایک دوست کے پاس غیر ملک جا رہا تھا۔ اور اپنے کاغذات کے لئے دوڑ دھوپ کرتا پھر رہا تھا۔ اس کی دلچسپیاں اپنے گھر اور شہر سے ختم ہو چکی تھیں۔ وہ یہاں سے جلد از جلد کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا!۔

اور آفریں کو لوگ کسی دلچسپی میں الجھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ بہت خود فراموش ہو چکی تھی! جہاں کھڑی ہے۔ بس، کھڑی ہے۔ جہاں بیٹھی ہے وہاں سے اٹھنا بھول گئی۔ اس نے اپنی تمام کتابیں اٹھا کے ردی میں پھینک دیں۔ افسانوں اور کہانیوں کے مجموعے الماری پر اس طرح ڈال دیئے کہ دوبارہ نظر ان پر پڑ نہ سکے!۔ سب جانتے تھے کہ اسے شہزاد کا غم تھا۔ وہ اندر اندر چھنک رہی تھی!۔ اور اپنی پہلی شخصیت کا عکس رہ گئی تھی!۔

تنہائیاں اس کی ساتھی اور ماضی کی یادیں اس کا مقدر رہ گئی تھیں!۔ اب اسے تمام باتیں چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ یاد آتیں۔ اس کا سنجیدہ چہرہ۔ اس کے مہذب اور متین اطوار، اس کی گفتگو، کیا وہ شروع ہی سے اس کا گرویدہ نہ تھا۔ افسانوں اور کہانیوں کے ذریعہ پردے پردے میں اپنی باتیں کہتا تھا۔ وہ اظہار محبت کا قائل نہ تھا۔ اسے بس آنکھوں سے گفتگو کرنی آتی تھی۔ اور آفریں بد نصیب آنکھوں کی زبان

پڑھ نہ سکی تھی۔ وہ مغرور کم آمیز عزلت نشین نہیں تھا۔ وہ ایک شریف سا لڑکا
کہا جاتا تھا۔ آفرین ہی نے اسے نہیں پہچانا۔ اس نے تو کہا تھا۔
دیکھی تھی ایک لڑکی مشرقی آداب کی تصویر۔ کیا اس کی نسبت نہیں
کہا تھا۔ کاش آفرین سمجھ سکتی!۔

اور وہ رات جو اس کی زندگی میں خوشی رنگ نغمے دے کے آئی تھی۔
اوٹی کے سرد موسم کی ایک گرم رات۔ جب وہ اس کے قریب آگئی تھی۔ اس کے
اندر لٹ جانے کی تمنا شدید ہو گئی تھی۔ یہ تو وہ تھا جس نے ہاتھ نہیں بڑھایا
ورنہ اپنی بربادی پر آفرین تاعمر سے بھولی نہ سما پاتی!۔
شہزاد۔ آپ مجھے کتنی محرومیاں دے گئے۔ وہ بس رو پڑتی۔
ایک دفعہ تحسین نے اسے اجازت دے دی وہ شہزاد کو دیکھ آئے۔
اس دن موسم بہت بے قرار کرنے والا تھا۔ اودے بادلوں کے پرے
کے پرے آسمان کے چہرے کا نقاب بنتے جا رہے تھے۔ ہواؤں کے دم
گھٹتے ہوئے تھے۔ درختوں کی چوٹیاں لرزہ براندام تھیں۔ اور ایسے موسم
میں آفرین شہزاد سے ملنے پہنچی تھی!۔
ہر طرف ایک پُرشور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یا پھر آفرین ہی کے دل کی
دھڑکن بند ہو چکی تھی!۔
نرس نے اسے شہزاد کے کمرے میں پہنچا دیا۔
اس نے پردہ سرکایا۔ شہزاد اپنے بستر پر اونچے سرہانے سے ٹیک
لگائے بیٹھا تھا! آہٹ پر اس نے رخ موڑا۔ آفرین پردہ برابر کر کے
اس کے پاس آئی۔

"آداب!" اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا۔ کچھ کہے بغیر ضرار نے اس کی تقلید کی۔ وہ کچھ حیرت اور تعجب سے آفریں کو دیکھ رہا تھا۔ شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی اس کی آنکھوں میں نہ تھی!۔ آفریں کے دل پر برف کی سلیں گرنے لگیں۔ کیا یہ وہی شاندار، معزز، اعلےٰ تعلیم یافتہ انسان تھا۔ جو بڑا مغرور اور مردم بیزار مشہور تھا۔ اس کا لباس میلا اور پرشکن تھا۔ بال بڑھ گئے تھے۔ چہرے پر بالوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ ضرار نہیں معلوم ہوتا تھا!۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" آفریں کے لب کپکپانے لگے۔

اس نے بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا دیا۔

"مت کہئے۔ یوں مت کہئے!" آفریں بے تاب ہو کر اس کے پہلو میں گر گئی۔ "یاد کیجئے۔ میں آپ کی آفریں ہوں۔ ذہن پر زور دیجئے۔ کیا آپ کو آفریں یاد نہیں؟۔ کتنی باتیں کرتے تھے آپ۔ اب بدنصیب ہے۔ یاد کیجئے!۔ خدا کے واسطے۔" وہ سسکیاں لے کر رو پڑی تھی۔

"روتی کیوں ہو؟" ضرار نے کہا۔

"آپ کو میرے رونے سے دکھ ہوتا ہے؟" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں!۔ مگر مجھے دکھ ہوتا ہے!"

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ہاں!" ضرار نے سر ہلایا: "تم بہت ستاتی ہو مجھے۔ راتوں کو میں

سب زمین بوس ہو گئے۔

انھوں نے اس پر ایک متاسفانہ نظر ڈالی اور اٹھ کر چلے گئے۔ عرشیہ اپنے پہلے بچے کی ولادت کے سلسلہ میں اپنے میکے جا چکی تھی۔ گھر کے مرد اور لڑکے اپنے اپنے کام سے باہر چلے جاتے تو گھر قبرستان ہو جاتا۔ برکہ بھی بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ اسے تھوڑے ہی دنوں بعد نجانے کتنی مدت کے لئے باہر جانا تھا۔

دونوں لڑکیاں رات بیٹھتیں تو آپس میں رونے رلانے کے لئے بھولے سے ان کے لبوں پر ہنسی نہ آتی۔

آفریں کو اپنی محبت کے بے اثر ہونے کا غم تھا۔

برکہ کو اپنی بد قسمت ماں کی فکر تھی۔

ساجدہ بیگم کی تقدیر بھی عجیب ستم ظریف تھی۔ میجر صاحب کے بعد احسان صاحب ساجدہ کو اپنے پاس لے آئے۔ حالانکہ ان سے احسان صاحب کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن وہ پرانا رشتہ نبھائے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ذاتی طور پر اپنی تقدیر کی ماری ہوئی بے در تھی۔ مجبور بھی تھی۔ اور اب تو یہ بھی حقیقت واضح تھی کہ ظہار کے چلے جانے کے بعد کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ نہ بے چاری کا کوئی میکہ تھا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ بے چاری نے خود کو سب سے کمتر اور لاوارث سمجھ کر گھر کے ادنیٰ کام سنبھال لئے تھے۔ وہ جاہ و حشم وہ رعب و وقار جو میجر صاحب کی زندگی میں ان کی بیگم کی حیثیت سے باقی تھا۔ ختم ہو چکا تھا۔ وہ تو ظہار ہی سے شرمسار اور خائف رہتی تھیں۔ وہ سب جانتا تھا۔ اس کے باپ کی

قاتل دراصل اس کی بے وفا سوتیلی ماں ہی تھی!۔ لیکن وہ خاموش تھا!۔ کبھی اس نے بھولے سے بھی نہ کہا تھا کہ اس کی امی کی جذباتیت نے اس کے باپ کی جان لی تھی۔ بلکہ وہ تو الٹا ماں کی دلجوئی کرتا۔ اور ان کو تسلیاں دیتا تھا کہ باہر جا کے وہ خوب کمائے گا اور انھیں اتنا روپیہ بھیجے گا کہ وہ بڑے آرام سے رہ سکیں گی۔ اظہار کی اعلیٰ فطرت اور شرافت نے باجرہ بیگم کے دل میں اس کی بے پناہ محبت بھر دی تھی۔

گھر میں شادیوں کی تیاریاں ہوتی رہیں!۔ اور تاریخیں طے ہو گئیں۔ اس دن آفریں نیم پاگل سی ہو گئی۔

اس نے برکہ کی گود میں منہ چھپا لیا "اب کوئی امید نہیں۔ برکہ۔ اب کوئی توقع نہیں رہی۔ آہ۔ میں اب تک اس آس میں تھی کہ شاید وہ کہیں سے آجائیں گے۔ اچانک وہ میرے سامنے آکے کھڑے ہو جائیں گے۔ ان کی آواز مجھے دوبارہ زندہ کر دے گی وہ کہہ دیں گے۔ کہ آفریں۔ میں آگیا۔ اب تمھیں دوسرے ہاتھوں سے چھین لوں گا۔ برکہ۔ ایک آواز سنائی دیتی ہے مجھے۔ روئی روئی سی آواز۔ کوئی بلا رہا ہے مجھے۔ میں اس کے پاس نہیں پہونچ سکتی!۔ کہاں وہ کہاں ہیں۔ آہ برکہ۔ شاید کبھی زمین و آسمان مل جائیں۔ مگر اب ہم نہ مل سکیں گے!۔ برکہ۔ کیا میں انھیں کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ برکہ۔ وہ دنیا میں ہیں بھی کہ اس دنیا سے چلے گئے۔؟ اس جہان خراب نے انھیں کیا دیا تھا۔ حسرت اور آنسو!" پھر وہ رونے لگتی۔ اس کے ساتھ برکہ بھی رو دیتی۔

"خدا کرے کہ ضرار بھائی اچانک چلے آئیں"

تب میں بھائی جان کے ہاتھ جوڑوں گی پاؤں پڑوں گی کہ مجھے میرے ہمراز سے ملادیں۔ ان کے بغیر زندگی ایک سزا ہے۔ گریہ مسلسل ہے زندگی نہیں ہے!!۔

لیکن کچھ نہ ہوا۔ بعض دعائیں دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں مگر وہ آسمان پر نہیں پہونچتیں۔ خدا تقدیر کے لکھے پر لکیر نہیں کھینچ سکتا۔ خدا دعاؤں کا پابند نہیں ہے۔ دعاؤں سے اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا! اسے اپنی طاقت و قدرت کا مظاہرہ بھی تو کرنا منظور ہوتا ہے۔ اگر وہ سب کی دعائیں سنتا رہے، قبول کرتا رہے۔ تو پھر اس کی اپنی مرضی کیا باقی رہے گی!!؟ خوشی سے یا ناخوشی سے رضا بالقضا کا فلسفہ آدمی کو بھگتنا ہی ہے!!۔

توصیف نے اپنی بہنوں کو بادلِ ناخواستہ رخصت کیا۔ ان کا دل رو رہا تھا۔ تقدیر اگر اس طرح اپنے ہاتھ کی ان دیکھی تلوار کسی کی محبت کے گلے پر نہ مارتی تو آج ان کی مظلوم بہن ایک ناپسندیدہ گھر میں رخصت ہو کے نہ جاتی! انہوں نے آفریں کا وہ آخری گریہ سنا تھا۔ وہ اس طرح روئی تھی جیسے آپ اپنے جنازے پر رو رہی ہو۔ اسے گلے سے لگا کر توصیف بھی رو پڑے تھے! اپنا بے زبان دوست انھیں بڑی شدت سے یاد آرہا تھا!۔

انہار بھی چپ چاپ تھا۔ برکہ کی تمنا اس کی زندگی کی پہلی اور آخری

تمنا تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی اس کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن وہ لمحے جب ملی جب کہ اس کے دل پر اپنے باپ کا غم ہنوز بادل کی طرح چھایا تھا!۔ اور وہ خوب جی بھر کے آنسو بہانا چاہتا تھا!۔

آفریں اور برکہ اپنے گھروں کو سدھاریں۔ اور اپنے پیچھے یہ دیکھنے نہیں آئیں کہ ان کے بعد در و دیوار پر کتنی اداسی اور ویرانی چھا گئی تھی!۔ اب وہاں اندھیروں کا راج تھا۔ روشنیوں کا دم نکل چکا تھا۔ اس گھر کے مکیں مسکرانا تک بھول گئے تھے۔ انھیں غیر شعوری طور پر احساس ہو رہا تھا کسی طور پر انھوں نے بے جا ظلم و ستم ڈھایا تھا۔ کسی کے خونِ ناحق سے ان کے ہاتھ رنگین ہو گئے تھے۔ اور اب کوئی تلافی کوئی مداوا حالات کو پیچھے کی طرف نہیں موڑ سکتا!۔

تومیت کے یہاں انہی دنوں پہلے بچے کی آمد کا غلغلہ مچا تھا۔ وہ دل بہلانے کے لئے اکثر اپنی سسرال چلے جاتے۔ تنظیم نے پھر ہوسٹل آباد کیا دادی اماں جو بیمار رہنے لگی تھیں۔ کمرے میں پڑی رہتیں۔ زینب خاتون کو اپنی بیٹی کی جدائی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنا ذہن بٹانے کے لئے پڑوس میں چل دیتیں۔ اور بے چاری ہاجرہ پر خانہ داری کا سارا بوجھ ڈال دیا تھا۔ ان کا عجیب حال تھا۔ انھوں نے رفتہ رفتہ خود کو مجرم اور گناہ گار سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جب تک برکہ ان کے پاس رہی۔ وہ اپنے آپ کو بہلائے رکھتیں۔ اس کے جانے کے بعد ان کے شب و روز بہت کٹھن اور دشوار گزار ہو گئے!۔ دادی اماں نے انھیں میجر صاحب مرحوم کے گھر جانے نہ دیا۔ اظہار اور برکہ جب مسقط چلے گئے تب تنہائی انھیں ڈسنے

لگی۔ اب ان کا سارا وقت کچن میں یا دادی اماں کی خدمت کرتے گزرتا۔ پیار کا
احساس کمتری اور احساس گناہ کے مارے کسی سے زیادہ بات چیت بھی
نہیں کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ دوسرے لوگ بھی انھیں نگاہوں سے
گرانے لگے ہیں۔ تاہم ایسا نہ تھا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ ڈاکٹر الطاف نے
اپنی سابقہ بیوی کی روزانہ مصروفیت پر تیکھے چٹکلے بجانا شروع کر دیا۔
کبھی کبھی وہ ایسے وقت کچن میں پہنچ جاتے جب گھر بھر میں وہ اکیلی
ہو جاتیں۔ مگر اب ہاجرہ بیگم پر ان کی فطرت کھل چکی تھی۔ صرف ان کی نااہل
محبت نے ان کا بنا بنایا گھر اور وقار اجاڑ ڈالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب شاید اب
بھی انھیں اپنی ہی ملکیت سمجھتے تھے۔ یہ درمیانی وقفہ انھیں یاد نہ رہا تھا لہٰذا!
ہاجرہ کو کچن میں مصروف دیکھ کر وہاں پہنچ آتے۔ کبھی چائے کی فرمائش
کرتے، کبھی ناشتہ مانگتے اور کبھی صرف ان سے اظہار ہمدردی کی خاطر۔
"ارے تم کسی وقت آرام بھی کرتی ہو کہ چوبیس گھنٹے بس انھی فضولیات
میں الجھی رہتی ہو! تم خادمہ تو نہیں ہو۔ ارے بھئی ہاجرہ۔ اس طرح تو
بیمار ہو جاؤ گی!"

ہاجرہ ایک دفعہ ان کے سامنے سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں
میں غصے کی چمک تھی۔ گالوں کی رگیں ابھری تھیں۔ اور لب فرط غیظ میں کانپ
رہے تھے۔ ڈاکٹر الطاف کی متجسس نگاہیں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ
اب بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ اڑتیس سال کی عمر میں بھی پچیس سال کی حسینہ
والہ سال کی اگر وہ مان جائے تب پھر چہک اٹھے گی۔

ان کی نگاہوں نے ہاجرہ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ بڑے تلخ و ناگوار لہجے میں

بولیں؟" مجھے یہ بتائیے کہ میری بیماری یا صحت سے اب آپ کو واسطہ کیا ہے؟
کبھی دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا کہ یہ بدترین نوبت بلائی ہوئی کس کی ہے؟ اب
آپ یہ فضول کے نخرے مجھ سے مت کیا کیجئے۔ سنا آپ نے۔ اب میرا رشتہ آپ
سے رہا نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ اماں بی نے بے سروسامان
سمجھ کے پناہ دی ہے۔ آپ ان کی محبت کا سہارا بھی مجھ سے چھین لینا
چاہتے ہیں۔ یہ ظلم مجھ پر اب مت کیجئے۔ مت کیجئے ایسا ظلم مجھ پر۔ پھر میں
کہاں جاؤں گی؟" انھیں اپنی حالت پر بے اختیار رونا آ گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے نادم ہونا یا جھینپنا سیکھا ہی نہ تھا۔ بدستور جوانوں کے
سے لہجے میں بولے "میری ہمدردی کا اُلٹا مطلب نکالا ہے تم نے۔ خدا لگی!
یہاں پیغمبروں نے بھی غلطیاں کیں اور سزائیں جھیلی ہیں۔ میں تو بڑا گناہ گار
آدمی ہوں۔ مجھے اپنی کوتاہیوں، زیادتیوں اور غلطیوں کا اعتراف ہے۔
اور اعتراف کے بعد معافی مجھے ملنی ہی چاہئے۔ کیونکہ اب میں تنہا ـــــــ!"

"کیوں آخر کیوں؟" غضبناک ہو کر ہاجرہ نے بات کاٹی۔

"ہاجرہ۔ تمھیں اور مجھے اب تک بہت سی ٹھوکریں لگ چکی ہیں۔ زخم
اب تک دکھ رہے ہیں۔ جو کچھ تقدیروں میں لکھا تھا وہ ہم نے بھگت لیا۔
شاید تم یہ سوچ رہی ہو کہ میں پھر تم سے غلط بیانی کر رہا ہوں۔ نہیں! میں
تم سے سچ کہتا ہوں۔ چاہے تمھیں مشکل ہی سے یقین آئے کہ کبھی
تمھارا خیال میرے دل سے نہیں نکلا۔ ہمیشہ میں نے تمھیں یاد کیا اور اپنی
جلد بازی کی بھیانک غلطی پر پچھتاتا رہا ہوں۔ لیکن چونکہ تب کسی قسم کا
مداوا میرے اختیار میں نہ تھا۔ لہٰذا میں بھی خاموشی سے اپنی قسمت کو

جگت رہا تھا! اور شاید میری نادانیوں کا تاوان تم بھی بھگت ہی رہی تھیں۔ لیکن۔ اب۔ صورت حال کچھ اور ہے۔ تم ابھی سہارے کی محتاج ہو۔ ہاجرہ۔ اور میں بھی تمہارے دست رفاقت کا طلبگار۔ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کر دینا چاہیئے۔ اگر تم۔ مطلب یہ کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں بھائی صاحب سے گفتگو کر دوں؟"

"نہیں۔ مجھے اب بے شرم نہیں بننا ہے!"

ان کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کو نیم رضامندی کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ وہ اپنی بے پناہ مسرت کو بمشکل مغلوب کر سکے۔ اور محبت سے بولے: "اس میں کچھ بے شرمی کی بات نہیں۔ تم خلاف شرع کوئی کام نہیں کر رہی ہو۔ رہا دنیا والوں کی انگشت نمائی کی بات۔ تو۔ ہمیں۔ جاننے پہچاننے والوں کے درمیان رہنا ہی کب ہے۔ ہم تمہیں لے کر کسی اور جگہ چلا جاؤں گا!"

"کوئی ضرورت نہیں۔ میں جی لوں گی کسی نہ کسی طرح۔ مجھے آپ کے سہارے کی بالکل حاجت نہیں۔ آپ کو گرہستی کے لئے کوئی خادمہ نما بیوی چاہیئے۔ تو آپ کوئی اور گھر بسا لیجئے۔ ہنسی خوشی تباہ ہو جانے والیاں بہت سی مل جائیں گی!"

"مجھے معاف نہیں کرو گی؟"

"کبھی نہیں!!"

"بہت اچھا!" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب چلے گئے!۔ ہاجرہ دل تھام کر رہ گئیں۔ یہ پچاس کے قریب پہونچ رہے ہیں مگر ابھی تک وہی مردانہ وجاہت اور حسن قائم ہے۔ جس کی یاد نے ان پر کیسی سرشاری طاری کر دیا تھا اور بے خودی

تھے۔ توصیف ان کے کسی معاملہ میں دخل نہیں دے سکتے تھے۔ ویسے ان کا
دل دکھتا تھا۔ پتہ نہیں۔ یہ لوگ ضرار کے کوئی عزیز رشتہ دار ہیں کہ ضرار کی
بدحواسی سے اچھا خاصا فائدہ اٹھا رہے ہیں!۔ پہلے کبھی توصیف نے ضرار
کے منہ سے کسی کرنل ڈاکٹر یا بیرسٹر کا کوئی تذکرہ نہیں سنا تھا!۔ انھیں ہمیشہ
کسی نئے چہرے سے ملنا پڑتا تھا۔ جس کے بارے میں توصیف کو صد فی صد
گمان گزرتا کہ وہ کوئی فریبی دھوکے باز ہے!۔ صحیح معنوں میں ضرار کی
تباہی پر توصیف کا دل خون کے آنسو روتا۔ لیکن کوئی مداوا ان کے پاس نہ تھا۔
ایک دفعہ جی کڑا کر کے وہ بنگلور، میسور اور اوٹی کے چکر بھی لگا آئے تھے۔
لیکن لاحاصل۔ اوٹی کا وہ بنگلہ جو ضرار کی ملکیت تھا۔ خالی تھا۔ اس کے
گورکھا چوکیدار نے توصیف سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس کی خدمات ہمیشہ سال
کی جاتیں جب مالک یہاں آکر رہتا تھا۔ ورنہ وہ صرف چوکیدار رہتا تھا
جس کی تنخواہ اسے نئے مالکوں سے مل جاتی تھی۔ اسے بھی ضرار نے مالک کی
بیماری اور علاج کے سلسلہ میں باہر کی روانگی کی اطلاع دی تھی۔ وہ کوئی نئی
بات نہ بتا سکا!۔ رفتہ رفتہ توصیف نے اپنے دوست کو صبر کر لیا۔ نجانے
کس نے اسے کہاں لے جا کے ٹھکانے لگا دیا اور اس بدنصیب کے سارے
کارخانے پر قابض و متصرف ہو گیا!۔

انہی دنوں وہ ایک بچے کے باپ بنے تھے۔ زندگی کی نئی دلچسپیوں نے
انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا!۔ انھیں گھر کی طرف بھی دھیان دینا پڑتا تھا
وہ بنگلہ جو آدمیوں سے چہلکا کرتی تھی۔ اب ویران تھی۔ آفریں برکہ اور
اظہار جا چکے تھے۔ الطاف صاحب، ماہرہ اور ان کے تینوں شریر لڑکوں

سے گھر خالی ہو چکا تھا۔ اوصاف صاحب پنشن پانے کے بعد گھر پہ ٹکتے ہی نہ تھے۔ وہ کسی ذاتی درسگاہ میں کام کرنے لگے تھے۔ صبح کے گئے اپنے دوستوں میں بیٹھ کے گپ شپ کرنے کے بعد رات کے دس گیارہ بجے گھر آتے اور پڑ کے سو رہتے۔ دادی اماں مستقل بیمار اپنے الگ تھلگ کمرے میں پڑی رہا کرتیں۔ عزیزہ کو ان کے شوہر اپنے گھر لے گئے۔ تو فہیم تو برائے نام گھر پر رہتے اور پھر بورڈنگ ہاؤز چل دیتے۔ جیسے دن بھر کسی گھنیرے درخت پر چہچہانے والے رنگ برنگی پرندے شام ہوتے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر گئے تھے۔ اب ہر طرف سکوت تھا۔ سناٹا تھا۔ ویرانی تھی۔ پرانے اور اچھے دنوں کی یادیں تھیں۔ ان کی جگر کا دی تھی۔

سب سے زیادہ خیال توصیف کو آفریں کا آتا تھا۔ اس نے سفیان کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول نہ کیا تھا۔ وہ تو مارے باندھے کا سودا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا کے بلند ارادے۔ آفریں ملک سے باہر نہیں گئی تھی۔ نیکی اس کا دل دنیا سے اس قدر اکتا چکا تھا کہ پھر کبھی اس نے زندگی کے کسی کارنامہ میں ہنسی خوشی حصہ نہیں لیا۔ ویسے وہ بڑی خوشحال اور مطمئن لگتی تھی۔ کم سے کم دیکھنے والوں کو۔ اور ہر ایک آدمی نظر باز نہیں

ہوتا۔

سفیان بڑا خوش مزاج اور شریف مزاج کا تھا۔ وہ آفریں کا سچی ہوئی بات کے ہنال ہو گیا تھا۔ ہمیشہ وہ آفریں کی تعریفیں کرتا رہتا۔ بڑی سگھڑ، سلیقہ شعار، اور ذہین آشنا۔ وہ اس پر فریفتہ تھا۔ ہر دم اس کی طبیعت کا خیال رکھتا۔ اس کی منفرد پسند کو سراہتا رہتا۔ اس کی ادبی دلچسپیوں

کو جو آفریں کے نزدیک مردہ ہو چکی تھیں۔ ہر دم تازہ کرتا۔ اور اِدھر اُدھر
سے تلاش کر کے عمدہ عمدہ کتابیں، معیاری و موقر جریدے لاتا رہتا تھا۔
مگر صرف ورق گردانی کی حد تک آفریں کو دلچسپی تھی۔ وہ بس فہرست میں
لکھنے والوں کے نام دیکھ لیتی اور بس۔ اسے بڑا اطمینان ہوتا۔ اچھا ہی
ہوا کہ اس نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ ورنہ "وہ" کیا سوچتے۔ ان کی بربادی
تباہی اور بیماری کا آفریں پر اتنا سا بھی تو اثر نہیں ہے۔ وہ ہر طرح خوش
اور مطمئن ہے اور برابر لکھ رہی ہے!۔

نہیں۔ اب میں چاہوں بھی تو نہیں لکھ سکتی۔ وہ پہروں بیٹھی سوچا
کرتی۔ ضرار۔ آپ کہاں ہیں!؟ کیا سچ مچ آپ کا دل اتنا کمزور تھا کہ آپ
کے ڈیڈی کی موت کا صدمہ سہار نہ سکا!؟ کیا کبھی آپ نے سوچا تھا کہ اتنی
بڑی تبدیلی اتنا فاناً ہو جائے گی؟ ہماری زندگیوں میں اتنا بڑا انقلاب
رونما ہو جائے گا۔

ہم اس طرح دور ہو جائیں گے جیسے زمین سے آسمان دور ہے۔ دونوں
آپس میں لازم و ملزوم ہیں مگر آپس میں ملتے کبھی نہیں! ضرار۔ یہ تو میں
ہی باتیں بنا رہی ہوں۔ ورنہ میرا ہر اشارہ آپ کو میرے قریب لے آتا۔ آپ
چپ رہتے، میں [illegible] ہنستی، شرماتی رہتی!۔ کیا کبھی آپ نے بھولے سے
بھی سوچا تھا کہ ایک بہت دلی تمنا تھی آپ کو اپنے دل و جان کا نذرانہ
دینے کی، جو ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی اور اس ڈر سے ہونٹ سیئے رہتی تھی
کہ آپ کو اس کی ضرورت [illegible] تھی!۔ کیا یہ سچ [illegible]
[illegible]

آپ سے محبت کی تھی۔ ہمیشہ آپ کا خیال نئی جہات بنا رہا تھا۔ آپ کا
تصور زندگی کی حرارت دیتا۔ آپ کی محبت بدن کے رگوں میں دوڑتی پھرتی
تھی۔ اور میں اپنی محبت کے دھیمے دیے چراغ اپنی آنکھوں میں جلائے
آپ کے سامنے آ رہی تھی۔ شاید ان کی تپش آپ نے بھی محسوس کی ہو۔ ان کی
روشنی آپ تک پہنچے۔ آپ کبھی اپنے گرد و پیش سے چونک کر اپنے سامنے
کبھی دیکھتے نہیں کہ وہاں بھی کوئی کھڑا ہے جہاں آپ کا خیال نہیں ہوتا۔
گزر فرار۔ دن اور رات کے یہ قیمتی لمحے ایک کے بعد ایک چھلتے اور ماضی کی
کہانی میں گرتے رہتے۔ اور ہر وقت لمحہ جو آپ کو میرے قریب لے آتا مجھ سے
بڑی دور ہو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ جن لمحوں کی یاد میری زندگی تھی۔ وہی
لمحے اب جان لیوا اور اذیت ناک بن گئے ہیں۔ جن کی یادیں طربناک نہیں۔ بہت
کربناک ہیں۔ آہ۔ ان روح فرسا تنہائیوں کو میں اپنے دامن دل سے کھرچ
کے کیسے نوچ پھینک دوں؟ جو دل کی رگوں میں پیوست ہو چکی ہیں۔ کبھی جدا
نہ ہونے کے لئے۔ فرار۔ لوگ کہتے ہیں۔ دل کی تڑپ کا اثر دوسرے کے
دل پر ضرور ہوتا ہے۔ کیا لوگ جھوٹ کہتے ہیں؟ میں بے چین ہوں۔ لمحہ لمحہ
کا زہر پی رہی ہوں۔ اور آپ پر میری بیقراری کا کچھ بھی اثر نہیں ہے!۔
آپ کو بالکل پرواہ نہیں۔ وہ بے بس مجبور، درماندہ آفرین جو آپ کی
زندگی سے نکل گئی وہ کہاں گئی۔ آہ۔ آپ نے کبھی یاد نہیں کیا۔ کبھی نہیں
سوچا۔ کبھی نہیں پکارا۔ کبھی آواز نہیں دی!!

بے خبری میں آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہتے۔ اور وہ دنیا ومافیہا
سے غافل اپنے دلکش ماضی کے چمنستان میں پھرا کرتی۔ لیکن اس کا دامن

خوش رنگ پھولوں اور سربند کلیوں سے لبریز ہونے کی بجائے اس کا دل طرح طرح کے کانٹوں سے زخمی ہو جاتا۔ اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا۔

اسے جسم کا ساتھی ملا تھا۔ اس کی روح کا ساتھی جُدا ہو چکا تھا۔ وہ سفیان سے ڈرتی رہتی۔ اگر اسے پتہ چل جائے۔ وہ اس کی تمام سوچوں کو کبھی مجسم دیکھ لے تو پھر۔ وہ اس کے سامنے مسرور و متبسم رہنے کی کوشش کرتی مگر اسے یقین ہوتا۔ اس کی کوششیں ناکام رہتی تھیں!۔

کبھی کبھار سفیان اسے دلگرفتہ دیکھ کر استفسار کرتا۔

"پھر کوئی ادبی الجھن آپ کو پریشان کر رہی ہے؟۔ بہت پراگندہ دل رہتی ہیں آپ۔ کیا کوئی ایسی بات ہے۔ جو مجھے بھی بتانا نہیں چاہتیں!"

اور آفریں فوراً سوچا ہوا بہانہ بیان کر دیتی "اس افسانے کا انجام بہت دردناک تھا۔ آپ کے آنے سے پہلے وہی پڑھ رہی تھی!"

سفیان اس کی خاطر قہقہہ لگاتا واہ بھئی۔ آپ تو خود افسانہ نگار ہیں۔ جانتی ہیں کہ جھوٹی اور فرضی تحریروں میں قلم کا سارا زور صرف ہو جاتا ہے۔ ان میں آنسو بہانے کے قابل سچائی کہاں ہوتی ہے؟؟!"

"پھر بھی دل پر کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے!"

"اگر ایسی بات ہے تو میں پھر کبھی کوئی کتاب یا پرچہ نہیں لاؤں گا۔ مجھے یہ کب گوارہ ہے کہ میری لائی ہوئی چیز آپ کے گریہ و افسردگی کا سبب بن جائے" پھر وہ اسے سمجھانے لگتا۔

"آپ کی عمر کو تو ایک مسلسل تبسم ہونا چاہیے۔ خوش رنگ اور منور

دورِ حیات جس میں رتی بھر فکروں کا غبار، اداسی کی دھند اور آنسوؤں کی نمی نہ ہو۔ اور پھر آپ کو میرے لئے بھی مسکرانا چاہیئے۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش اور مسرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب بھی آپ اداس ہوتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کمی مجھ میں ہے!۔ کوئی خلا ہمارے درمیان ہے۔ جیسے نہ آپ پر سکتی ہیں اور نہ میں۔ آفریں۔ کیا میرا اندازہ سچ ہے؟"

آفریں کا سارا خون اس کے گالوں پر اکٹھا ہو گیا۔" نجانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔ بات اصل میں یہ ہے نا کہ۔ آپ کے گھر کا ماحول نیا ہے۔ مجھے اماں جان اور بڑی باجی سے شرم لگتی ہے۔ کچھ دن اور گزر جائیں گے تو پھر میں سب میں گھل مل جاؤں گی! تب آپ کو شکایت نہ رہے گی!"

شکایت؟۔ واہ!" سفیان ہنس پڑا۔" ارے تم شکایت اور اظہارِ خیال میں فرق نہیں کر سکتیں؟۔

وہی سہی!" آفریں بھی ہنسنے لگی۔

"میں اب چھٹیاں لے رہا ہوں۔" اس نے آفریں کو بہلایا۔" ہم کہیں دور گھومنے چلیں گے!۔ دراصل ایک شہر میں اور ایک جگہ مستقل پڑے رہنے سے بھی انسان گھبرا جاتا ہے...... تم بھابی کی طرف چلی جایا کرو۔ وہ تو تمھاری پھوپھی ہیں۔ وہاں تمھاری طبیعت بہلی رہے گی!"

"مجھے کہیں جانا آنا نہیں ہے۔ میں وہیں رہوں گی جہاں آپ رہیں گے۔" آفریں بولی۔ اور دل ہی دل میں سہم گئی۔ کیا وہ دُہری شخصیت بن کر رہ جائے گی؟۔ دل میں کچھ۔ منہ پر کچھ اور۔ مگر کچھ بھی ہو۔ جو شخص وہم کی طرح

مضبوط اس کے دل میں آبیٹھا تھا اُسے دور کرنا ممکن نہیں رہا تھا! محبت جو زندگی سے بڑھ کر ہے۔ ایک ابدی جذبہ۔ انسان مر جاتا ہے۔ محبت باقی رہتی ہے!۔

لیکن پھر آفریں نے خود کو کسی قدر سنبھال لیا۔ چپکے چپکے کسی کو تنہائیوں میں چاہنا بھی بڑا احیات آفریں مشغلہ ہے!۔ اس نے سوچا کہ اب وہ سفیان کے سامنے ہر طرح سرد رنظر آنے کی کوشش کرے گی!۔

اور پھر قدرت نے خود بخود اس کی فکروں کی راہیں دوسری طرف موڑ دیں۔ اسے پتہ چلا۔ اس کی ہستی کی محدود دنیا میں ایک اور جہانِ نو تعمیر ہو رہا تھا۔ اس احساس نے اسے عجیب عجیب سے کرب دیئے۔ ناقابلِ بیان سی کیفیت، ناقابلِ فہم سے خیالات۔ کیا وہ ماں بنے گی؟۔

اور پھر وہ گوناگوں اندیشوں میں گھر گئی:۔

لوگ کہتے ہیں۔ حجلۂ تاریک میں بھی بچے اپنی ماں کے خیالوں کا تاثر قبول کرتے ہیں۔ اور اس کے ذہن پر ازل سے ضرار چھایا ہوا ہے۔ اگر اس کا ہونے والا بچہ۔ اس کے محبوب کی شکل لے آیا تب۔ اور پھر خوف و مسرت کے جذبے اسے مغلوب کرنے لگتے!۔ تنہائی میں بھی اس کے رخسار دہک اٹھتے۔

اگر میرے بچے نے "ان" کی شکل پائی۔ تب۔ تب۔ میرے اللہ۔ ایک ننھا ضرار میری گود میں ہمک اٹھے گا!۔ مگر نہیں۔ نہ نہ کیا کہیں گے یہ سب دیکھنے والے۔ اسے رونا آنے لگتا۔ ضرار۔ آپ میرے دل سے نکل جائیے!۔ اس طرح مجھے مت ستایئے!۔ آپ میرے سکون و آرام کے خواہاں رہتے

تھے۔ پھر آپ نے میرے دنوں کو لوٹنا میری راتوں پر ڈاکہ ڈالنا کیوں شروع کر دیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے سُکھ سے جینے دیجئے۔ خدا کے واسطے!۔

سفیان تو خوشی کے مارے دیوانہ سا ہوا جا رہا تھا!۔ اس کے والدین اپنی نازک سی کم سخن بہو کا بے حد خیال رکھتے!۔ سفیان ہر دس بارہ دن بعد خود جا کے لیڈی ڈاکٹر کو لاتا اور اس کی ہدایت کے مطابق بیوی کی خبر گیری کرتا۔ اس کے لئے ٹانک، پھل اور نجانے کیا کیا الم غلم اٹھا لاتا وہ مجبوراً ہو جاتی!۔ اس نے ابھی تک صحیح معنوں میں اپنے شوہر کو ہدیۂ الفت پیش نہیں کیا۔ اسے نہیں چاہا۔ اس سے ریاکاری کی۔ منافقت برتی۔ اس کی خدمت نہیں کی۔ سال بھر کے عرصہ میں اس نے کبھی سفیان کو چائے تک بنا کے نہیں دی!۔ کبھی اسے اس کے دکھ سُکھ سے سروکار نہ رہا۔ ایک مرتبہ اسے ہفتہ بھر تک مسلسل بخار آتا رہا تھا۔ تب وہ اپنی ماں کے کمرے میں رہا تھا۔ وہی اس کی خدمت کرتی رہی تھیں۔ اور آفریں نے اس سے بخار کی کیفیت بھی نہیں پوچھی تھی۔ سفیان خود اس سے کہتا تھا وہ اپنے کمرے میں جا کے سو رہے۔ اماں جان یا باجی بیگم اس کا سر دبا دیں گی۔ دوا پلا دیں گی!۔ وہ اپنے کمرے میں آتی اور سو جاتی۔ اس کے بے مہر سلوک کی کسی نے بھی شکایت نہیں کی!۔ اور اب۔ وہ تو "صحتمند بیمار" تھی۔ پھر بھی گھر بھر اس پر پروانہ وار فدا ہو رہا تھا!۔ وہ انھیں کوئی فقید المثال تحفہ تو دینے والی نہیں تھی۔ ہر عورت ماں بنتی ہے۔ لیکن سفیان یہ سمجھتا تھا کہ آفریں کوئی بے مثال پہلا اور آخری کارنامہ انجام دے رہی تھی!۔ سفیان اور اس کے والدین آفریں کا اس قدر خیال رکھتے کہ مبالغہ اور

غلو کی حد تک پہونچ جاتے اور وہ شرمانے لگتی! حتیٰ کہ اسے سفیان پر ترس آنے لگتا!۔

"تمھیں پہلی دفعہ لڑکا پسند ہے کہ لڑکی!" وہ بچوں کی طرح پوچھتا۔

"میں کیا جانوں؟" اسے خاصی شرم آئی۔

لڑکا ہو چاہے لڑکی ہیں تو اسے سینے سے لگا لوں گا۔ تمھارے تبسم کا ایک حصہ ہوگا نہ وہ۔ مجھے بہت پیارا ہوگا!۔ وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگا"۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ نام کیا رکھو گی۔ آج کل تو نئے منے ہلکے پھلکے نام رکھنے کا طریقہ چلا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں۔ ان کے بیٹے کا نام باقر ہے۔ اسے وہ پیار سے باقی کہتے ہیں۔ مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ تمھیں کیسا لگا؟"

"میں نے بھی اس بچے کو دیکھا۔ بہت حسین ہے!"

"ہاں!" وہ مسکرایا۔ "کسی حسین اور شاندار شخصیت کا تصور کیا کرو۔ سنتے ہیں کہ پھر بچے بھی خیالوں کا عکس ہوتے ہیں۔ میں تو خیر اتنا حسین اور خوبرو نہیں ہوں میرا تصور مت کرنا۔ اچھا!"

آفریں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ پاگل پن کی حد تک سیدھا سادا۔ معصوم۔ دنیا کے مکر و فریب سے دور۔ چاہے جانے کے قابل!۔ اگر وہ ایک شخص کے تصور کی اتنی وفادار نہ ہوتی تو اسے چاہنے لگتی!۔ کبھی کبھی اسے سفیان پر ترس آنے لگتا۔ وہ اس کی تقدیر کا ساتھی کیوں بن گیا تھا

تین سال کی طویل مدت کے بعد اظہار اور برکہ مسقط سے واپس آئے
ان کے ساتھ ان کے دو ننھے ننھے بچے بھی تھے۔ ننھا افتخار جو اپنے دادا کا
ہم شبیہ اور ہم نام تھا۔ دو سال کا تھا اور منو چار پانچ مہینے کا۔ بڑے پیارے
گول مٹول بچے تھے۔ برکہ اب منچلی سی کھلنڈری لڑکی نہیں۔ بڑی معتبر سی
خاتون لگتی تھی۔ اظہار لمبا چوڑا بارعب "مرد آدمی" لگ رہا تھا۔ اس
نے نہایت گنجان سی ابابیلی مونچھیں رکھ لی تھیں اور اب اتنا شوخ و بذلہ
سنج نہیں رہا تھا۔ چونکہ باپ بن گیا تھا۔ لہٰذا بہت سنجیدہ ہو چکا تھا۔
سفیان اور آفریں ان سے ملنے آئے۔ آفریں کا بیٹا اب خوب دوڑتا پھرتا
تھا۔ یہ لڑکیاں جو بچپن کی حدود سے نکل کر مائیں بن چکی تھیں۔ جب آپس
میں ملیں تو اپنے پرانے دنوں کو اپنے سہانے بچپن کو اپنی بے خبر جوانی کو کبھی
ماضی کے وزنی پتھروں تلے سے نکال لائیں
توصیف کا گھر ایک بار پھر چھلک اٹھا۔ ان کے دو بچے، اظہار کے بچے اور
آفریں کا بچہ دن بھر صحن میں چہچہاتے پھرتے۔ سفیان اور اظہار گھومنے
پھرنے میں وقت گزارا کرتے۔ زینب خاتون پر نئی طاقت عود کر آئی تھی۔
ہاجرہ بیگم اور ڈاکٹر صاحب بھی آئے۔ اب ان کی ازدواجی زندگی بڑی
بے غبار اور مطمئن تھی۔
ایک دوپہر بچوں کو تعظیم کے حوالے کر کے آفریں اور برکہ برآمدے میں
اسی جگہ آ بیٹھیں جہاں کنوارپنے میں بیٹھی بے تہہ بے معنی باتیں کیا کرتی
تھیں۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہیں پھر آفریں نے گفتگو چھیڑی۔
"تم نے تو خط لکھنے کی قسم ہی کھا لی برکہ۔ کیا ایسی میری یاد نہ آئی ہے

دل سے نکل گئی تھی!"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آفریں" برکہ بولی "بھلا تم دل سے نکل جانے والی چیز بھی ہو۔ مگر میری مصروفیت بھی تو بہت رہتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ماما ملتی نہیں۔ اوپر سے بچوں کی دیکھ بھال۔ اللہ میاں نے اتنی جلدی دوسرا بھی دے دیا۔ رات رات بھر میں ان کی وجہ سے سوتی نہیں۔ وہ ہنسنے لگی "کبھی کبھی تو دونوں ساتھ ساتھ اٹھ کے شور مچاتے ہیں"

"اظہار بھیا ہاتھ نہیں بٹاتے؟"

"بہت ساتھ دیتے ہیں۔ اچھا تم اپنی کہو۔ سفیان بھائی تو بہت سیدھے سادے مسلمان لگتے ہیں۔ تم سے ان کی کس طرح نبھتی ہے!"

ہاں، برکہ۔ بس اللہ کا احسان ہے جو کچھ ہے" آفریں بولی۔

"خدا نہ کرے۔ آفریں۔ تم مجھے اداس معلوم ہوتی ہو!۔ کیا بات ہے؟"

بات؟" آفریں نے ہلکی سی سانس لی "ایک یاد کا چھپا ہوا کینسر ہے۔ برکہ۔ برا۔ ہستہ آہستہ میری زندگی کا خون چوس رہا ہے۔ تم کو اپنے بچوں کی قسم۔ کہنا نہیں کسی سے۔ آج میں ایک بیوی ہوں۔ ایک ماں ہوں۔ مجھے ہر طرح کا آرام اور سکون حاصل ہے۔ لیکن۔ اُس آدمی کی یاد میرے دل سے نہیں نکلتی!۔ میں کیا کروں برکہ؟"

"فراز بھائی کی خیر خبر نہیں ملی!" برکہ بھی رنجیدہ ہو گئی۔

"شاید سال بھر پہلے ان کے ڈاکٹر نے کہیں سے بھائی جان کو اطلاع دی تھی کہ وہ کسی قدر صحت مند ہو کر جرمنی سے لوٹ آئے ہیں۔ بھائی جان

ان سے ملنے بمبئی گئے تھے۔ لیکن۔ ملے کہ نہیں ملے۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں نے ان کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ میرے دل کا چور میرے لبوں سے بول پڑتا برکہ۔ یہی خوف تھا مجھے!!"

آفریں! تمہیں خدا کا واسطہ۔ اب ان کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں اپنے بچے کی خاطر خوش و خرم جینا ہے"۔ برکہ بولی!" وہ بادِ سموم کا ایک جھونکا تھے۔ تمہارے خیالوں کو جھلسا دیا اور چلے گئے۔ اب ان کا خیال کر کے کیا تم خود کو دق لگاؤ گی۔ یا اپنے بچے کو تباہ کرو گی۔ پاگل بہن! اتنی سمجھ نہیں ہے تم میں؟!"

"ہاں۔ میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی"۔

اب بھی افسانے اور کہانیاں لکھتی ہو؟"

جی نہیں لگتا۔ میں تو اب پرچوں در چولہ کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی!!"

"اچھا کرتی ہو۔ مارے جی کا جنجال ہے یہ ادبی روگ بھی"۔

اظہار بھائی کتنے مہینوں کے لئے آئے ہیں؟"

ایک ماہ کے لئے۔ پھر نجانے کب آنا ہو گا؟"

بھائی جان اور چھوٹے بھیا بھی خلیجی ممالک میں قسمت آزمائی کے لئے پر تول رہے ہیں۔ دادی اماں کے بعد امی کا جی بھی گھبرا گیا ہے۔

اچھا ہے ذرا باہر کی ہوا کھائیں۔

"کبھی تم سفیان بھائی سے کہہ کے وہاں آنے کا پروگرام بناؤ"۔

"اچھا۔ اب یہ ایک مہینے کے بعد بمبئی اور دہلی کی سیر کرنے جا رہے ہیں۔

میں ان سے کہوں گی۔ اسی طرح ایک چکر کبھی تمھارے یہاں کا لگائیں!"

اس شام چائے پر سب موجود تھے۔ برکہ نے توصیف سے ضرار کے بارے میں پوچھا! لیکن اس پیرایہ میں نہیں کہ توصیف کو آفریں پر شبہ ہوتا۔

"ضرار بھائی کی کوئی خیر خبر ملی۔ بھائی جان؟ ایسا دل دکھتا ہے ان کے لئے۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئے؟!"

توصیف کھنکھارے اور چائے کی پیالی چہرے کے برابر اٹھا کے جواب دیا "ایک خط مجھے ملا تھا ان کے فیملی ڈاکٹر کی معرفت۔ اس نے محض سرسری طور پر اطلاع دی تھی کہ مسٹر ضرار کسی قدر درست ہو کر جرمنی سے واپس لوٹ آئے ہیں۔ لیکن ابھی معالجین کی رائے میں اتنے صحت مند نہیں کہ پہلے کی طرح کاروبارِ زندگی میں حصہ لے سکیں۔"

"ہائے بتائیے۔ وہ آج کل کہاں ہیں۔ میں جا کے مل آؤں" برکہ بولی۔ اظہار نے بھی تائید کی۔ اور بہت اشتیاق ظاہر کیا۔

"کرنل صاحب انھیں اپنے گاؤں لے گئے۔ میں ان سے جا کے مل آیا تھا۔ بس ٹھیک ہیں۔ صحت مند نہیں کہلائے جا سکتے!" توصیف بولے۔

"کہاں ہے گاؤں۔ ہم جاتے ہیں۔ زیادہ تکلیف نہیں دیں گے۔ بس سلام کرکے اور خیریت پوچھ کے آجاتے ہیں" اظہار نے کہا۔

"اب تو وہ گاؤں میں بھی نہیں۔ شاید مدراس کے قریب کسی ساحلی علاقہ میں قیام ہے۔ میں نے پوچھا نہیں تھا۔ منتظر ہوں کہ پھر حیدرآباد آئیں تو ملوں گا جا کے!" توصیف نے کہا۔ اظہار اور برکہ چپ ہو گئے۔

توصیف نے آفریں کو دیکھا۔ لیکن کوئی ردِ عمل اور تغیر اس کے چہرے پر نظر نہ آیا۔ وہ اپنے بچے کی طرف جھکی بڑے انہماک سے اُسے چمچہ چمچہ چائے پلا رہی تھی۔ توصیف کو اطمینان ہو گیا۔ انھوں نے آفریں کی پُرنم آنکھوں میں نہیں دیکھا۔ جہاں اس کے دل کا خون اکٹھا ہو گیا تھا۔

اظہار مسلسل مزاح کی باتیں کئے جا رہے تھے۔ دفعتاً آفریں ان کی طرف مڑی اور بولی:" اظہار بھائی۔ یہ آپ نے اپنے ہونٹوں پر گھونسلہ کب بنایا ہے؟" اور پھر اس طرح بے اختیار ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

کیا ہوا" سفیان گھبرا گیا۔

اظہار چپ ہو گئے۔ وہ سب سمجھ چکے تھے۔ اپنا نچلا ہونٹ انھوں نے دانتوں میں جکڑ لیا۔

تم رونے لگیں۔ بہن!" پھر اظہار نے پاس آ کر اس کے آنسو پونچھے

" آپ سب کے جانے کے بعد کتنی تنہائی ہو جائے گی۔ اظہار بھائی"

آفریں نے کہا۔ سفیان اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

" ٹھیک ہی تو ہے۔ بہت دور سے اپنے لوگ آتے ہیں، اور پھر بہت دور چلے جاتے ہیں!۔ آفریں کا دل یوں ہی بہت کمزور ہے۔ جب آپ حضرات جانے لگیں گے تو میں انھیں ایئرپورٹ نہیں لے جاؤں گا!"

سب خاموش رہے۔ یہ کہہ کر بڑے تاثر سے سفیان کا چہرہ تکنے لگے۔

توصیف چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد اظہار بھی اٹھنے لگے!۔ باجرہ جواب ان سے بے نیاز

محبت کرتی تھیں۔ ان کی شکل دیکھنے لگیں۔ ان کا خاموش استفسار کچھ رحم طلب سا تھا۔ اظہار نے بڑی نرمی سے کہا۔ "جب سے یہاں آیا ہوں۔ امی۔ ایک دفعہ بھی ڈیڈی کے سلام کو نہیں گیا۔ اجازت دیجئے!" انھوں نے سر اٹھا کر برکہ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بچوں کو ماں کے سپرد کر کے اظہار کے ساتھ چلی گئی!۔ سفیان آفریں کے پاس آ بیٹھے! ان لوگوں میں پچھلی باتیں ہونے لگیں۔ سفیان بڑی دلچسپی سے ماضی کی کہانیاں سنتے تھے۔

ایک ماہ کا ایک ایک لمحہ ان لوگوں نے زندگی کی دلچسپیوں سے شیرینی نچوڑ کے گزارا۔ بالآخر اپنی ردّا فرساجدائی کا خنجر سب کے سینے میں اتارتے اظہار برکہ اور ان کے بچے واپس چلے گئے! عزیزہ پھوپھی ہاجرہ، وغیرہ بھی سدھارے!۔ دنیا پھر اپنے معمول پر آ گئی۔

آفریں پھر اپنے گھر چلی آئی۔ لیکن اس مرتبہ وہ اپنا دل و دماغ اپنے محسوسات اور ساری دلچسپیاں میکے ہی میں چھوڑ آئی تھی۔ اس کی حالت عجیب تھی!۔ خود کو سب کے سامنے خوش و خرم ظاہر کرنے کے لئے اسے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا تھا!۔ اسے خود پر ترس آتا۔ دنیا نے اسے سب کچھ دیا تھا۔ اچھا گھر، چاہنے والا شوہر، خوبصورت صحت مند بچہ!۔ اسے اور کیا چاہئے تھا۔ لیکن اس دفعہ میکے میں پچھلے دن لوٹ آئے تھے۔ اور اسے پھر یادوں کا کرب دے گئے تھے۔

اس نے یونہی وقت گزاری کے طور پر اپنی پرانی الماری سے وہ تمام چیزیں نکالی تھیں۔ جو اس کے کنوارپن کی یادگار تھیں۔ ان میں اسے

اپنا ایک فائل بھی ملا تھا۔ جس پر گرد جم چکی تھی۔ بڑی دیر تک آفریں اسے ہاتھوں پر لئے خالی الذہن سی دیکھتی رہی تھی۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی گرد بھی صاف کرے! پھر اس نے گرد دیکھی تھی اور وہ اس کے خیالوں کی طرح منتشر ہو گئی۔ دھڑکتے دل سے اس نے فائل کھولا اور اس کا قلب اُلٹ گیا۔

اس میں کتنے پرانے کاغذات، چھوٹی چھوٹی کترینیں، اخبار کے تراشے۔ اپنے زمانۂ تعلیم کے لکھے ہوئے ادھورے افسانے، کہانیاں اور جانے کیا کچھ تھا۔ اس نے ایڈیٹر صاحبان کے خط تک احتیاط سے سنبھال رکھے تھے۔ اور اس کے سسرال جانے کے بعد امی نے اس کی تمام چیزیں جوں کی توں رکھ چھوڑی تھیں!۔

آفریں نے آنچل سے اپنی آنسو بھری آنکھیں صاف کیں۔ اور وہ چھوٹی سی بیاض نکالی۔ جو اس نے اس امید پر رکھی تھی کہ کبھی اسے فرصت نصیب ہوئی تب وہ ان اچھوتے اشعار کو بڑی بیاض میں نقل کرے گی۔ مگر! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! کئی سسکیاں اس کے لبوں پر مچلیں۔ کئی بے چین موتی ٹپ ٹپ کر کے ورق پر گرے اور گرد میں کئی شکلیں بنا دیں اس نے پلکیں جھپکائیں۔ اور صفحہ پر لکھا دیکھا۔ نجانے اس نے کب لکھا تھا۔ اُسے عصر حاضر کا بے مثال شاعر خاکر بہت پسند تھا۔ اور وہ تھا بھی۔ کائنات ادب و شعر کا پروردگار، اقلیم قلم کا تاجدار۔ سیدھے سادے لفظوں میں اس نے دل میں اتر جانے اور مدت العمر ایک کسک چھوڑ جانے والی ساحری کی تھی!۔ اس شاعر کے اچھوتے شعر اس نے لکھ رکھے تھے۔

جو اب بھی دل میں درد جگا رہے اور ماضی کو زندہ کر رہے تھے۔

محبت تم سے کی میں نے تمھارے بے وفا ہوتے
اگر تم با وفا ہوتے تو میں نے کیا کیا ہوتا

وہ دیر تک اس شعر کی حسرت میں ڈوبی رہی۔ پھر اس کی نگاہیں دوسرے شعر پر رکیں ؎

کیا تکمیل نقشِ ناتمام شوق کی خاطر
جو تم سے ہو سکا تم نے جو ہم سے ہو سکا ہم نے

الفاظ کا جادوگر۔ معنویت کا راز داں۔ ساحری کا شہنشاہ۔ اُسے خالد بہت پسند تھا!۔

اک ازلی التہاب اک ابدی اضطراب
مبدأ فیاض سے قسمت آزادگاں

مری رائیگاں زندگی کا بیاں
نہ مقصد نہ مصرف نہ منشا کوئی

سانس لینا بھی ہے دشوار گھٹن اتنی ہے
تا دمِ باز پسیں کیا یونہی جینا ہے مجھے

کس کو نہیں کرتا ہی قسمت کی شکایت
کس کو گلۂ گردشِ ایام نہیں ہے؟

کتنی ناکافی ہے انفاس کی پونجی خالد
کیا پس انداز کرے آدمی کیا صرف کرے؟

دل کے ہاتھوں سے سب لوگ لاچار ہیں اور محبت کی راہیں پُر اسرار ہیں

ابر و باراں کو پپیہا ترسے، عاشق نورِ سحر ہے سرخاب
چاند کے جلوے کا دیوانہ چکورا، ایک دو جے کیلئے ہم بیتاب

شام ہو گی تو میں دروازہ کھلا
چھوڑ کے راہ تکوں گا اس کی
میرے خوابوں میں ملاقات کا جس
دشمنِ جاں نے کیا تھا وعدہ
اس انتظار میں کہ خواب میں
تم آؤ گی
میں ساری رات جاگتا رہا۔ (عبدالعزیز خالد)

دیر تک آنسو بہانے سے اسے کچھ سکون ہوا۔ اور پھر دوسرے لمحے سینے میں محشر برپا کرنے والی بات ہو گئی۔ اس چھوٹی سی بیاض سے چند سال قبل کا لکھا ہوا، ایک خط نکل کے اس کی گود میں گر پڑا۔

آفریں! — السلام علیکم

آپ نے مجھے اپنا منتظر رکھا۔ اس کی کوئی شکایت آپ سے نہیں ہے۔ کیونکہ انتظار کروانا آپ کی فطرت اور انتظار کرنا میری عادت ہے۔ لیکن مجھے آپ کی تحریر کا شدید اشتیاق ہے۔ اگر کہانیوں کا مجموعہ ترتیب دے دیا ہو تو فوراً بھجوا دیجئے۔ میں اسے پرنٹرس کے حوالے کر کے ہی بمبئی جاؤں گا۔ ورنہ ایک ضروری کام رہ جائے گا۔ اور سنائیے۔ کیا گپ شپ ہے؟ آپ کی اسٹڈی کا کیا حال ہے؟

اچھا تو آپ جلد ہی آرہی ہیں؟!۔

خدا حافظ مخادین مرزا احمد خاں!

ایک تیز ٹیس اس کے دل میں اٹھی اور سارے جسم میں پھیر گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چھلک گئے!۔ اور وہ اس کا پرانا خط ہاتھ میں لئے گم صم بیٹھی رہی جیسے ذہنی طور پر کہیں بہت دور پہونچ چکی ہو۔ اپنی اس دنیا میں۔ جس کے روز و شب کی چھوٹی سی چھوٹی رعنائی اسے ابھی تک یاد تھی۔ جو ہزار پا کی طرح اس کے ذہن سے چمٹی ہوئی تھی!۔

یہ یاد میری جان لے لے گی!۔ وہ اپنی کیفیت سے گھبرانے لگی بڑی بے دلی سے سب کچھ اس نے واپس الماری میں رکھ کے بند کیا اور باہر نکل آئی۔ اس کا بچہ اپنی نانی کی وضو کرنے والی چوکی سے گر پڑا اور رو رہا تھا!۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر وہ ایک حسرت سی اپنے ساتھ اپنے گھر لائی۔

خیالوں کے سیلاب میں اس کی کمزور سی ہستی ہچکولے کھانے لگی! رفتہ رفتہ اس کی صحت گرتی گئی۔

سفیان نے اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دل کا دکھ نہیں جانتا تھا!۔ پریشان ہو گیا!۔ انہی دنوں دوبارہ آفریں ماں بنی تھی۔۔ اب وہ بہت کمزور اور نڈھال سی لگتی تھی!۔

ڈاکٹروں نے سفیان کو مشورہ دیا تھا۔ وہ آفریں کو کسی صحت افزا مقام پر لے جائیں۔ ورنہ کمزوری مستقل ہو کے کوئی روگ نہ بن جائے۔

سفیان کو والہانہ انداز میں اپنی تیمارداری کرتے دیکھ کر آفریں ایک روز رو پڑی :-

"کیا دیا میں نے آپ کو! جب سے آئی ہوں۔ آپ کو پریشان ہی تو کر رہی ہوں۔ آپ کی کوئی خدمت میں نے نہیں کی!۔ الٹی خدمت لے رہی ہوں!"

سفیان نے اسے باہنوں میں سمیٹ لیا۔ اور اس کے بالوں میں لب چھپا کر گلوگیر سی سرگوشی کی "میری دنیا، میری محبت، میری زندگی ہو تم۔ تمھیں میرے لئے صحت مند رہنا ہے۔ آفریں! مجھے تم سے کوئی خدمت اپنی منظور نہیں۔ بس تم مجھ سے محبت کرتی رہو۔ اور کیا چاہئے مجھے اس کے سوا!"

اور تب آفریں اس کی سادگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ اس سے تھوڑی محبت بھی نہیں کرتی۔ محبت کی اداکاری کرتی رہی تھی۔ اسے اس کے بچوں کی ماں کہلانا بھی پسند نہ تھا۔ لیکن تقدیر نے اسے ریاکاری پر مجبور کر دیا تھا!۔ اپنے درد دل کا حال وہ کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا وہ ایک گہری دھند میں ملفوف ہے۔ دھند اسے اپنے بالے میں لئے ادھر ادھر اڑتی پھر رہی ہے۔ یا پھر اسے محسوس ہوتا۔ وہ ایک طویل ناگوار خواب دیکھ رہی ہے۔ جیسے خواب اس نے بہت سے دیکھے تھے۔ اور پھر ہمیشہ کسی عجیب سے ڈر سے اس کی آنکھ دھک سے کھل گئی تھی۔ مگر یہ خواب کبھی نہیں ٹوٹا!۔ اسے اپنی زندگی کو ایک حقیقت سمجھنے خاصی کوفت ہوتی!۔ ایک افسانہ وافسوں

کی پرستار روح کا مادّی زندگی کی جانگسل مشقتوں سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں تھا!۔ اور یہ بھگتان اس کا قطرہ قطرہ خون نچوڑ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا واقعہ اس کے رہوار تخیّل کو مہمیز لگا جاتا اور پھر وہ اپنے محور سے ہٹ جاتی!۔

لیکن جب اسے ہلکی سی بیماری کا ایک جھٹکا لگا تب اس کے ذہن کی گرہیں کھل گئیں۔ ایک وہم سا ہوا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کے ننھے منّے بچے کہاں جائیں گے۔ ننھا فیضان اور نوزائیدہ ارمغان خدا نے اسے دو بیٹے عطا کئے تھے۔ اور وہ کفرانِ نعمت کی گناہ گار رہی تھی۔ اس کی زندگی ہی میں دونوں بچے کس مپرسی کی حالت میں جی رہے تھے۔ اگر سفیان کی بڑی بہن انھیں سجا سنوار دیتیں تو وہ انسانوں کی شکلوں میں نظر آتے۔ ورنہ اُسے ان سے اتنی بھی دلچسپی نہ تھی کہ وہ فیضان کا ہاتھ منہ ہی دُھلا دے!۔ لیکن جب اُس نے بچوں سے دلچسپی لینی شروع کی تو اسے پتہ چلا کہ دنیا اتنی ویران، زندگی اتنی حقیر اور اس کی گرہستی اتنی غیر اہم نہیں کہ ان سے اس طرح مُنہ موڑ کے جیا جائے!۔

اور تب بادلِ ناخواستہ وہ بھی جینے کی سزا بھگتنے کے لئے از سرِ نو غیر دلچسپ چیزوں میں دلچسپی لینے لگی!۔ یہ تو ہر عورت کی لگی بندھی ازلی تقدیر ہے۔ گھر بار، شوہر، بچے اور الجھنیں۔ وہ کہاں تک فرار کی جستجو میں بھاگے گی۔ اسے ہر پھر کے اسی مقام پر آنا تھا!۔

پھر اس نے سوچ لیا۔

یاد اُن کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اور اس نے اپنے بچوں کو آغوش میں سمیٹ لیا!۔

اس سال میدانی باشندوں کا خیال تھا کہ ایسی شدید گرمی کبھی نہ پڑی ہے! جیسے سورج اپنی بلندیوں سے نیچے اُتر آیا تھا۔ شجر، حجر اور بشر، سبھی پر آفتاب گرم بھوبھل برسا رہا تھا! صبح کی شروعات کے ساتھ دھوپ میں تیزی آنے لگتی! بڑے پریشان تھے۔ بچے گھبرائے ہوئے! سورج گرہن اپنے اثرات چھوڑ رہا تھا۔ اکثر صاحب استطاعت لوگ جوق در جوق ٹھنڈے مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے!

سفیان نے بھی کہیں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

"ہم کل شام کو نکل چلیں گے۔ میں آفس سے ایک ماہ کی چھٹیاں لے رہا ہوں۔ انشاء اللہ مئی کے بعد چلے آئیں گے۔ تب تک برسات کے موسم کا آغاز ہو جائے گا۔ تم دن بھر اسباب درست کر لینا!"

"جائیے گا کہاں؟!"

"قریبی جگہ بنگلور ہے۔ وہاں میرے ایک دوست کا بنگلہ بھی ہے۔ فی الحال وہیں چلیں گے۔ اس کے بعد میں سوچوں گا کہ نینی تال یا کشمیر

جا سکیں۔"

آفریں کا دل دھڑک اٹھا۔ لیکن اس نے غیر اہم سے لہجے میں کہا: "نینی تال اور کشمیر گیا۔ مہینے بھر کی تو بات ہے۔ آپ بنگلور ہی چلئے!"

"اُدھر ہٹا ہے اوٹی!" سفیان نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بھی ان کی خاطر مسکرائی۔

دوسرے روز سفیان سفر کی تیاریوں میں مشغول رہے تھے۔ اور وہ ان کی بہن بڑی باجی سے مل کر رخصتِ سفر درست کرتی رہی! بڑی باجی بھی ان دونوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔

آفریں نے بہت چاہا کہ وہ پچھلے سفر کی دل خوش کن یادوں کو اپنے ذہن کے کسی رخنے سے بھی اندر نہ گھسنے دے۔ اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی!۔

اور پھر ان کی گاڑی انہی جانے پہچانے راستوں پر جا رہی تھی۔ جہاں سے چار پانچ برس پہلے وہ گزر چکی تھی۔

مگر تب اور اب۔ کتنا طویل فاصلہ تھا۔ اُس آفریں اور اِس آفریں میں!۔ ان دنوں وہ ایک خوش و خرم بے خبر سی لڑکی تھی۔ اور آج۔ اس نے بہتیرے دکھوں کا مزہ چکھ لیا ہے۔ اَن گنت زخم اپنے دل پر برداشت کیے ہیں۔ وہ تجربہ کار ہو چکی ہے۔

"یہی اوٹی ہے!" بڑی باجی دہشت زدہ تھیں: "میرے خدا۔ ان پگڈنڈیوں پر سے صحیح سلامت گزر جائیں بس سمجھو کہ نئی زندگی پائی!"

اُس کے اپنے کہیں بڑی دور تھے!۔
ایک چھوٹے سے بنگلے کے احاطہ میں کار پہونچ کر رُک گئی!۔
"اُتر یے۔ بڑی باجی!" سفیان نے کہا۔ آفریں گہرے خواب سے چونکی!۔
یہ آپ کے دوست کا بنگلہ ہے؟!" اس نے کہا۔
وہ بنگلور میں ہے۔ ہم تو اوٹی چلے آئے ہیں۔ یہ ڈاک بنگلہ ہے"!
اوٹی!" ایک ہوک سی اس کے دل سے نکلی۔ اور نظریں دُھندلے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔
"مجھے "ان" سے ملا دے..... میرے اللہ":
پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور ننھے سے ارمتان کو جو اُونی سویٹر اور کنٹوپ میں اُون کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ اپنی گود میں لے لیا اور بے تعلقی سے سفیان کے پیچھے قدم بڑھا دئے!۔
وہ رات بڑی سرد تھی!۔ چوکیدار نے آتشدان میں بہت سے کوئلے سلگا دئے تھے اور ہیٹر بھی آن تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بڑی باجی نے میز پر ڈرائی فروٹ کا ڈھیر لگا دیا۔ آفریں اپنے فیقی کو گود میں لئے بیٹھی اُسے کاجو کے ٹکڑے کھلا رہی تھی!۔
ممی! کل بہت سے کھلونے اور ٹافیاں لیں گے"۔ وہ تتلا کر بولا۔
ہاں! چھوٹی سائیکل اور ارتی کے لئے لکڑی کا گھوڑا!" آفریں نے جھک کر اس کے ریشمی رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دئے!۔
جہاں بھی تم جاؤ۔ آفریں مگر کبھی اپنے لاڈلے فیقی کو میرے ہی پاس

چھوڑ جاؤ" بڑی باجی نے کہا، "تم جب تک واپس نہیں آجاتیں مجھے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے!"

"کیوں بجیا!" آفریں نے ہنستے ہوئے پوچھا، "آپ اس قدر ڈرتی ہیں کیا؟!"

"ہاں۔ بیٹی۔ مجھے تو بہت وحشت ہوتی ہے" انھوں نے چھیلے ہوئے مٹھی بھر چلغوزے اس کی طرف بڑھائے "تمھارا یہ بیٹا سڑکوں پر اس طرح بھاگتا ہے جیسے گھر میں اپنے آنگن میں دوڑ رہا ہو۔ خدانہ کرے۔ نہیں آفریں۔ تم اسے لے کر باہر مت جانا!"

"اچھا۔ بڑی باجی جیسا آپ کہیں" آفریں بولی۔

"میں بھی کل جاؤں گا۔ واپسی کے لیے ریزرویشن کروانا ہے۔ اور کچھ ٹریولنگ چیک بھی کیش کرانے ہیں" سفیان نے کہا، "آپ کہیں نہیں جائیں گی؟"

"نہ بیٹے" بڑی باجی نے نفی میں سر ہلایا، "ہم گرمی سے پناہ مانگ کے یہاں آئے ہیں۔ یہاں کے مناظر دیکھنے نہیں آئے۔ پہاڑ، ندیاں، باغ۔ یہ سب اپنے حیدرآباد میں بھی ہیں!"

"میں ایک دفعہ یہاں آچکی ہوں" آفریں بولی۔ اور بچے کو تھپکنے لگی۔ دونوں بہن بھائی اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

"ہاں۔ شاید تم نے مجھ سے ایک بار تذکرہ کیا بھی تھا" سفیان نے کہا۔

"جی ہاں" آفریں بولی "تب اظہار بھیا، برکہ، بھائی جان اور عرشیہ بھابی ساتھ میں تھیں۔ اوہ۔ زمانہ کتنا آگے بڑھ گیا ہے۔ سب گرہستی کے

چکر میں پڑ گئے۔ کچھ دور ہو گئے، کچھ بچھڑ گئے!"

"بچھڑ گئے؟" سفیان چونکے۔

"ہاں!" آفریں بھی چونک سی پڑی۔ "اظہار بھیا اور برکھا۔ کتنی دور چلے گئے۔" وہ ہنسی۔ "آج میں انہی فضاؤں میں بیٹھی اسے یاد کر رہی ہوں۔ مگر اسے کیا پتہ! وہ شاید اس وقت اظہار بھیا سے گپ شپ کر رہی ہے۔ گھر کا کام کاج کر رہی ہے۔ بچوں کو سلا رہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھی بڑی بجیا آپ کی طرح ان پہاڑی راستوں سے بہت ڈرتی تھی۔"

"اچھا!" وہ ہنس دیں۔

"اظہار بھائی ان دنوں بڑے شریر تھے۔ اسے بہت ڈراتے تھے۔" آفریں بولی۔ "اب وہ اپنے ڈیڈی کے مرنے کے بعد اتنے سنجیدہ ہو گئے ہیں۔"

"بہت شریف اور بلند خیال لڑکا ہے۔" سفیان نے کہا۔ "میرے سامنے انہوں نے بجیا جان کو ایک کافی بڑی رقم کا چیک دیا تھا اور کہا تھا کہ اسے ڈاکٹر صاحب کو نہ بتائیے گا۔ آپ خود جیسے چاہیے خرچ کیجئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی زمانہ ایسا... سوتیلے بیٹے اور سوتیلی مائیں بھی ہوتی ہیں!"

"وہ بجیا کے لئے بیش قیمت ہیرے لے کر آئے تھے۔ میرے لئے تو انہوں نے اتنی قیمتی یاقوت کی چوڑیاں دی تھیں۔ آپ کی گھڑی ــــ!" گیارہ بج رہے ہیں۔ بس۔ مجھے تو اب نیند آ رہی ہے۔ بیٹی سو گیا ہے۔ اسے میرے پاس لا دو۔ تم بھی آرام کرو۔ پھر کل یہاں صبح ناشتہ

کا بندوبست کیا ہوگا؟" بجیا نے کہا: "مجھے تو صبح نماز کے بعد ہی چائے چاہیئے!"

"میں ابھی چوکیدار سے معلوم کرتا ہوں" سفیان اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ بیٹھیے" آفریں بولی "میں صبح کو نماز کے بعد بجیا کو چائے دے دوں گی۔ اپنے ساتھ ہم سارا سامان تو لائے ہیں۔ ہوٹل کی چائے مجھے تو ذرا بھی اچھی نہیں لگتی!"

"بجیا چائے پیتی رہیں گی۔ اور میں نظر رکھتا رہوں گا" سفیان نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کیونکہ مجھ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا"

آفریں کھلکھلا کے ہنس پڑی "بڑے ندیدے ہیں آپ۔ بجیا کی چائے میں کیوں نظر لگائیے گا۔ کیا آپ کے لئے ٹومٹ سینڈ کے کافی بنانا کچھ مشکل کام ہے؟"

سفیان نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور ان چار سال کے طویل عرصہ میں پہلی دفعہ پہلے دن اسے سفیان بہت اچھے لگے۔ اونچے پورے جامہ زیب، پُر محبت، مخلص۔ اس نے کبھی انھیں کسی بات پر مشتعل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب کہ سفیان کی بجائے دوسرا شخص ہوتا تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ لیکن ان کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی۔ گویا ان کی فطرت کی تعمیر میں معماروں نے غصے کا کوئی جز شامل ہی نہیں کیا تھا!

"بھیا بھائی اب اٹھو۔ بیٹی، تم سویرے اٹھو تو مجھے نماز کے لئے ضرور جگا دینا!" بڑی بجیا نے کہا اور کھڑی ہو گئیں۔

"یہ سب کو نماز کے لئے جگاتی پھرتی ہیں۔ کبھی خود بھی نماز پڑھتی ہیں کہ نہیں!" سفیان نے شرارت سے کہا۔ "میں نے آج تک انھیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا!"

"آپ ہی کب پڑھتے ہیں!" تڑپ کر آفریں نے بدلہ لیا۔

"میں باہر مسجد میں پڑھ لیتا ہوں!"

"میں گھر کے کسی کمرے میں پڑھ لیتی ہوں!"

"ارے یہ کیا آدھی رات کو تم لوگ لڑنے لگے؟!" بجیا نے کہا۔ سفیان سر کھجاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بڑی باجی نے آگے بڑھ کر روشنی گل کی تب آفریں بھی چلی گئی!۔

دوسرے دن سفیان اور آفریں ساتھ ساتھ گھر سے نکلے۔ باجی نے بچوں کو رکھ لیا تھا۔ سفیان نے بلند آواز سے کہا۔ "سستے چھوٹے" اور بڑی زندہ دلی سے آفریں ہنس پڑی تھی۔

"شام تک آئیں گے واپس۔ آپ کھانا تیار رکھئے گا!" سفیان بولے۔

"تو پھر خیریت ہے!" بڑی باجی نے کہا۔ "منہ دھو رکھو!"

دونوں ٹہلتے ہوئے چلے گئے!۔ ایک ہوٹل میں انھوں نے کافی کی ایک ایک پیالی پی۔ پھر سفیان نے کہا۔

"تم جب تک اپنی شوپنگ کرو۔ میں ریلوے اسٹیشن اور بینک کے کام کرکے آجاؤں!"

"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ!" اس نے ضد کی۔

"بھیڑ بھاڑ میں پریشان ہو جاؤ گی"۔
اچھا تو پھر دیجئے شوپنگ کے لئے رقم!۔ ایک ہزار سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔ باجی کے لئے شال۔ آپ کے لئے کارڈیگن۔ اور۔ اور ۔۔!"
وہ فہرست سناتی ہی رہ گئی اور سفیان نے جیب سے۔ روپئے نکال کے اس کے حوالے کر دئے!۔
ایک دکان سے آفریں نے عادت کے خلاف پان خریدے اور مسکرا کر پان سفیان کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرا خود چبانے لگی۔
اس کے نکھرے ہوئے گلابی چہرے پر سرخ ہونٹ یاقوت کی قاشوں کی طرح دہکنے لگے!۔
"اُف، پاگل بنا دینے والی۔ کبھی اس طرح پان سے سرخ کئے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ تنہائی میں ملو"! سفیان نے بکھرے لہجے میں کہا۔
ہوش میں۔ ہوش"! آفریں نے ان کے کفِ دست پر باریک سی چٹکی لی"! آپ سڑک پر ہیں!"
اتنے میں ایک خالی ٹیکسی گزری اور سفیان نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیا۔ ان کے جانے کے بعد آفریں نے ایک بار پھر گرم شال اپنے کندھوں کے گرد برابر کی اور فٹ پاتھ پر چلنے لگی!۔
گرم کپڑوں کی بڑی دکان کچھ فاصلہ پر تھی۔ وہ آفریں کو اس لئے یاد رہ گئی تھی کہ بہت پہلے اپنی امی، چچی اور دادی اماں کے لئے سویٹر اس نے اسی دکان سے لئے تھے اور فٹ پاتھ پر بنڈل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کے گر پڑا تھا۔ جس سے ٹکرا کے ایک تیز رو راہگیر اوندھا گیا تھا۔

دفعتاً کسی نے اس کے پہلو کے برابر چلتے ہوئے چپکے سے کہا۔

"آفریں بی بی۔ سلام!"

ایک بھولی بسری آواز سن کر آفریں کا دل دھڑک اٹھا۔ قدم جم گئے! اس نے سر اٹھایا۔

"کہئے۔ آپ نے مجھے پہچانا؟"

"اوہ۔ آپ! سکندر خاں صاحب!" اس کی سانسیں پھولنے لگیں۔ "آپ یہاں ہیں۔ کب آئے؟"

"میں تو دو سال سے یہیں ہوں۔ بی بی۔ صاحب کے ساتھ!" سکندر خاں نے جواب دیا۔ "کالج کی نوکری میں نے تبھی چھوڑ دی تھی۔"

"اور۔ وہ۔ کہاں ہیں؟" ایک طوفانی جھکڑ سا اس کے دل سے چلا اور اس کے لب خشک ہو گئے۔

"آپ صاحب کو پوچھ رہی ہیں؟"

"ہاں!" اس نے بھیگتی ہوئی ہتھیلیاں شال میں چھپا لیں۔

"صاحب اپنے اُسی پرانے بنگلے میں ہیں!" سکندر خاں نے بتایا۔ "صاحب اچھے ہو کر جرمنی سے آئے۔ اور یہاں کرنل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے بڑی تاکید کی تھی کہ صاحب کو ابھی مکمل طور پر صحت مند نہ سمجھا جائے۔ وہ دماغی طور پر ابھی ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔"

"بیمار ہیں؟" جلدی سے آفریں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ بظاہر تو اچھے ہیں۔ مگر ڈاکٹروں نے انھیں مکمل دماغی آرام اور سکون کا مشورہ دیا تھا۔ صاحب واپس حیدرآباد جانا نہیں

چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا اگر کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں کوئی تماشا
نہ ہو۔ سکون ہو۔ مجھے اس منظر کا دھیان آ گیا۔ بس میں انہیں یہاں لے آیا۔
۔۔۔ تو تقریب قریب دو سال ہو گئے ہیں۔ آپ ۔۔۔ سے نہیں ملیں گی؟"
آفریں کے سینے میں آنسو کھنچ سے گئے۔

"لے چلو۔ مجھے ان کے پاس۔"

"لیکن بی بی۔ آپ براہ مہربانی خاص زبان رکھیے گا۔ کوئی بات ایسی
نہ ہو کہ ان کے ذہن پر ناگوار اثر پڑے۔ وہ بہت خاموش، اداس اور کہیں
گم رہتے ہیں۔ بی بی۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ ہیجان، دماغی انتشار ان کے
لیے بہت خطرناک اور مضر ثابت ہو گا۔"

آفریں کو ہوش کہاں تھا کہ پھر باقی راستہ کیسے کٹا۔ اسے تو سکندر خان
کی آواز نے پرانی دنیا سے واپس کھینچا۔

"سرکار اس کمرے میں ہیں۔ جائیے! میں ان کے لئے دوا یک ٹانک
لینے نکلا تھا۔ آپ چلی گئیں" سکندر خان نے کہا۔ "آپ ان سے باتیں کیجئے
میں دوائیں خرید کر بس تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔"

آفریں نے بالکل نہیں سنا کہ سکندر خان نے کیا کہا تھا۔ اور وہ کب
چلے گئے۔ اس کے سامنے چوڑے دروازے پر پڑا ہوا آسمانی جھولدار پردہ ہلکے
ہلکے لہریں لے رہا تھا۔

آفریں نے سکندر خان کی ہدایتیں بھلا دیں۔ وہ اس نے زندگی سے
کتنا بھی کہاں تھیں۔

تنزاز۔ شہد و شکر کی سی شیرینی نے اس کے لب آپس میں پیوست

کر دیئے۔ آج وہ از سر نو جی اٹھی تھی!۔ بے ضبط و بے قرار ہو کر اس نے پردہ ایک طرف سرکا دیا۔

ضرار۔ نہیں یہ میری آنکھوں کا دھوکا نہیں۔

وہ اس کے سامنے اپنی مسہری پر لیٹا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے رُخ پھیرا۔ اور شاید حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کے! اٹھنے لگا۔ لیکن آفریں نے اسے اتنا موقعہ بھی نہیں دیا۔ ایک ہذیانی چیخ آفریں کے لبوں سے نکلی۔

"اللہ۔ آپ ــــ!؟"

بس ایک بجلی سی چمک گئی۔ وہ جیسے پاگل ہو رہی تھی!! اسے خیال ہی نہ رہا کہ سکندر خاں ـــ نے اسے کیا ہدایات دی تھیں!۔ اچانک وہ جھپٹ کر ضرار کے سینے پر گری اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی!۔

ضرار نے اسے اپنے سینے پر بھینچ لیا۔ اس کے ہونٹ خود بخود آفریں کی مانگ پر جم گئے! ایک طویل سانس اس کے سینے سے نکلی اور اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ لوگ اس لمحہ کے دیر سے منتظر تھے۔

پھر ضرار ہی سنبھلا۔ اس نے اپنی انگلیاں آفریں کے بالوں میں اُلجھا دیں اور اپنا لہجہ اور آواز قابو میں کر کے کہا۔

"بس کرو۔ آفریں۔ بس کرو۔ یہ تم کیسی نا سمجھی کر رہی ہو؟"

اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا۔ ضرار سے اس کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرانے لگا۔ لیکن آفریں نے اس کا ہاتھ جھنجھوڑ دیا۔

"میں نے کون سا قصور کیا تھا۔ آپ ـــ نے اپنی کوئی خبر مجھے نہیں دی۔

کیا اس طرح بھی کوئی کسی کو بھولتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ دو سال سے یہاں ہیں۔ اور آپ میرا پتہ بھی بھولے نہیں تھے!"

"کیسے معلوم ہوا تمھیں کہ میں دو سال سے یہاں ہوں"۔ وہ ہنسنے لگا۔

"کہہ دیجئے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں"۔

او ہو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے لڑنے آ رہی ہو تو میں یہاں سے کہیں اور بھاگ جاتا"۔ وہ ہنس پڑا۔ "سنو۔ آفریں۔ سچ سچ بتاؤ تم یہاں کیسے آئی ہو؟ کیا تمھارے کوئی عزیز ——— !"

میری بات چھوڑیئے۔ آپ بتایئے۔ اب آپ کیسے ہیں"۔ وہ بولی۔

اس پر عجیب و غریب جذبات حاوی تھے۔ جیسے اسے یاد ہی نہ رہا تھا۔ وہ کسی کی بیوی، دو بچوں کی ماں اور ایک ذمہ دار خاتون ہے۔ اس کے لئے پھر پانچ سال پرانا دور واپس آگیا تھا۔ وہی روز و شب وہی افسانوی ماحول۔ اور غیر شعوری طور پر اپنا سب کچھ اپنا فراز۔ وہ اس کے لئے کبھی غیر اور اجنبی نہ رہا تھا۔ اور یہ طویل ماہ و سال کا فاصلہ فراز کو اس سے کہیں زیادہ قریب لے آیا تھا!۔

فراز بھی شاید اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ کبھی وہ اس طرح تعجب سے آفریں کی طرف دیکھنے لگتا جیسے اس کے وجود کو اپنے بہکے ہوئے تخیل کی کرشمہ آرائی سمجھتا ہو۔ اور کبھی بے پایاں مسرت کی چمک اس کے چہرے پر چھا جاتی۔ وہ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا!۔

آفریں۔ جسے وہ اس عرصہ میں بھول جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس کے سامنے آگئی تھی۔ اور آج پھر فراز کشمکش کے اس دوراہے

پر اُکھڑا اُٹھا۔ اسے یاد رکھے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فراموش کر دے۔
بتائیے۔ آپ کیا سوچنے لگے"۔ آفریں بولی۔ اب وہ سنبھل گئی تھی!۔
مزار نے اپنے پیروں پر پڑا ہوا کمبل دور ہٹایا اور بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اس
نے ایک عجیب سی نگاہ آفریں پر ڈالی۔ اس کے بعد تپائی پر سے اپنا
سگریٹ کیس اور لائیٹر اٹھایا۔
"ابھی بتاتا ہوں"۔ اس نے کہا اور سگریٹ لبوں میں دبا کے ہاتھوں
کے پیالے میں لپکتے لائیٹر کے شعلے پر چہرہ جھکا دیا۔
آپ نے اب بھی سگریٹ پینا نہیں چھوڑا؟" آفریں نے بڑے معصوم
لہجے میں پوچھا۔ اور اسے دیکھنے لگی۔ پہلے سے زیادہ حسین و خوبرو۔"
ہمیشہ تنہائیوں میں میرے ساتھ رہا ہے۔ جب اوروں نے میرا ساتھ
چھوڑ دیا تھا اس نے نہیں چھوڑا۔ اب میں اس کے ساتھ بے وفائی
نہیں کر سکتا"۔ اس نے ایک ہلکا سا کش لے کر آفریں کے چہرے پر
دھواں بکھیر دیا۔ شاید وہ اس طرح خود کو اور آفریں کو جذبات کے
اندھے کنویں سے باہر نکالنا چاہتا تھا!۔
پھر وہ آفریں کا چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگا"۔ بہت خوبصورت ہو گئی ہو۔
پہلے سے زیادہ۔ تمہیں دیکھنے کے لئے دو آنکھیں کافی نہیں ہیں!"
آپ شاید کچھ بتانا نہیں چاہتے!"۔ آفریں بولی۔
کیا بتاؤں۔ ڈیڈی کے مر جانے اور تم سے جدا ہونے کے بعد مکمل
بلیک آؤٹ"۔ اس نے کہا اور ایک لمبی سانس لے کر سگریٹ کا ٹکڑا
خاکدان میں ڈال دبا کر بجھا دیا۔ نہیں۔ زندگی کے وہ تین سال کیسے کہاں

دور کہیں تخریب ہوئے۔ اور جب آہستہ آہستہ حواس واپس آئے تو۔ یاد رکھنے کے قابل کوئی چیز ہی نہ رہی۔ نہ وہ فضا تھی، نہ وہ ماحول تھا، نہ وہ ساتھی تھے، نہ وہ میں تھا، سب کچھ بدل گیا۔ آفریں۔ زمین و آسمان بدل گئے!!

وہ اس کے سامنے صوفہ پر جا بیٹھا۔ اور اس طرح ہنس کر اسے دیکھنے لگا جیسے اپنی بات کے دل آزاری کی تلخی کو آفریں کے دل سے محو کرنا چاہتا ہو۔

وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جیسے اسے اپنی ناسمجھی کے گناہ ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ شہزاد کو فراموش کرنے کا گناہ، سفیان کو قبول کرنے کا گناہ، ان کے بچوں کی ماں بننے کا گناہ!۔ اس کے نصیب کا ساتھی تو شہزاد تھا۔ کسی اور نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ احتجاج نہ کر سکی!۔ چپ چاپ قسمت کے آگے سر جھکا دیا۔ اس نے شہزاد کا انتظار نہیں کیا!۔ وہ خود اپنا قصور معاف نہیں کر سکتی!۔

"کیا سوچنے لگیں آفریں؟" شہزاد نے پوچھا۔

"آپ۔ آپ!" وہ گھبرا گئی۔

"سنو۔ میں کس طرح خود کو بہلاتا ہوں!" وہ مسکرایا اور جھک کر تپائی پر رکھا ہوا اپنا ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ "یہ گیت" "اس گیت کا درد، اور نغمہ کا غم مجھے بہت پسند ہے۔ تم بھی سنو۔"

فضا میں پُر درد آوازیں ابھریں۔

ظالم زمانہ مجھ کو تم سے چھڑا رہا ہے
انجام زندگی کا نزدیک آ رہا ہے

بیتے دنوں کے نغمے دل آج گا رہا ہے
دنیا میں جیسے اپنی کوئی بلا رہا ہے

تجھ کو قسم ہے آکر صورت ذرا دکھا جا
دیوانہ دیکھ تیرا دنیا سے جا رہا ہے

بربادیوں کا اپنی شکوہ نہیں کسی سے
میرا نصیب مجھ کو یہ دن دکھا رہا ہے

گیت ختم ہوا۔ اور ضرار نے اسے ایک بار پھر ریوائینڈ کر دیا۔ لیکن آفریں آگے بڑھی اور اسے آف کر دیا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ شاید پچھتاوے اس کی رگ رگ سے لہو نچوڑ رہے تھے!۔

"آفریں۔ میں سمجھتا ہوں۔ دل کا اچانک بند ہو جانا بہت اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی کا دماغ اچانک فیل ہو جائے کیسی عجب ہوتی ہے یہ ذہنی تاریکی!" ضرار نے کہا اور پھر موضوع بدل دیا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ رات میں نے خواب دیکھا تھا کہ اجنبی بچے جوان ہو گئے ہیں اور وہ میری آغوش میں آ گرے ہیں۔ اور اس کی تعبیر ملی۔ مجھے منزل ملی۔ مراد ملی۔ مدعا ملا۔ اب مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جب بھی موت آئے۔ اور مجھے لے جائے!"

"تکلیف دینے کے ڈھنگ تو آپ کو بہت سے یاد ہیں" آفریں نے کہا۔

"تمھیں میری باتوں سے تکلیف ہوتی ہے!۔ اچھا تو تم سناؤ۔ ان پانچ برسوں میں تمہاری کیا کیا دلچسپیاں رہیں۔ کیا کیا تم نے۔ کہاں کہاں گئیں۔ اب کیا کر رہی ہو؟" اور میرے دوسرے چاہنے والے کہاں

کہاں ہیں۔ اظہار، توصیف، اور وہ چھوٹی سی لڑکی۔ اظہار جسے چھیڑتا رہتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا؟"

برکہ: "آفریں ہولے سے بولی" برکہ نام تھا اس کا۔ وہ آج کل مسقط میں ہے۔ اس کے دو بچے ہیں! اظہار بھائی سے اس کا بیاہ ہوا۔"

کمال ہے۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی کے دو بچے" وہ ہنسنے لگا۔ اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے نظریں جھکا کر سرسری لہجے میں پوچھا "اور۔ تم۔ تمہارے بچے۔ آفریں۔ کتنے بچے ہیں تمہارے۔ توصیف ایک دفعہ ملے تھے مجھ سے۔ کہہ رہے تھے کہ۔ اب تو سبھی۔ بکھر کے رہ گئے ہیں! اُف فوہ۔ جانے میں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے کبھی مل بھی سکتا ہوں کہ نہیں؟"

"میرے ساتھ چلئے میرے گھر!"

"دل کا بیمار ہوں۔ آفریں۔ چھ مہینے پہلے بہت خطرناک دورہ پڑ چکا ہے" اس نے کہا۔ اور گہری سانس لے کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

دل کی بیماری۔ یہ دکھ آپ نے کہاں سے لگا لیا؟" آفریں سہم کر اسے تکنے لگی۔

بارش کے مسلسل قطرے پتھر میں دراڑ ڈال دیتے ہیں آفریں۔ فولاد کو زنگ کھا لیتا ہے۔ انسان کا دل نہ لوہا ہے نہ پتھر۔ دکھ کے نشتر کیا اسے زخمی نہیں کر سکتے؟ لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ دل کا کام بھی ایک دن تھک کے سو جاتا ہے۔ مگر جب تک کہ وہ اپنی مراد کو نہ پہونچے۔ اور۔ پھر آفریں۔ میں۔ مجھے!! اس کے فقرے بکھرنے لگے۔

رہا. موہوم سی اُمید پر شاید پذیرائی ہو سکے. پوری چھپے بہانے بہانے سے وہ تمہیں وہ حقیر تحفے دیتا رہا کہ تم اُسے واپس نہ کر سکو. اس نے گمنامی اور بے نامی کا سہارا لیا. اپنے دل کی تسکین کی خاطر، وہ فریبی، بزدل نہیں تھا. اس کا دل صاف اس کی نیت بے داغ تھی. بس وہ تمہارے انکار اور اپنی بے حقیقت چیزوں کی نامقبولیت کے خوف سے تمہارے سامنے نہیں آتا تھا۔"

آفریں سانس روکے ضرار کی باتیں سن رہی تھی وہ چپ ہوا تو اس نے اپنی حیرت پر قابو پا کے پوچھا، "تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھا؟"

"ہاں آفریں. تمہاری لاعلمی کا کرب اس بدنصیب کے ساتھ قبر میں نہ چلا جائے. اس لیے وہ آج تمہارا آئینہ بن گیا ہے!"

"وہ آپ تھے" ایک چیخ سی آفریں کے لبوں سے نکلی. اور اس نے اپنے بے قابو دل کو تھام لیا۔

ضرار کے چہرے پر کرب واذیت، ندامت اور پچھتاوے دل کے سائے محیط ہو گئے تھے. اس نے آفریں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"محبت کا احساس ایک خول تھا میرے لئے. جس میں محصور میں سانسیں لئے جا رہا تھا. میں آہستہ آہستہ جینے کی عادت ڈال رہا تھا. لیکن اب تمہاری محبت کا عرفان میرے پیمانۂ دل میں نہیں سما رہا ہے آفریں. اسے شاید میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

اور دفعتاً جیسے آفریں پر دیوانگی سی طاری ہو گئی. وہ ضرار کے بازو

سے چپٹ گئی اور غیر ارادی طور پر الفاظ اس کے لبوں سے لڑھکنے لگے۔

"میں یہ نہیں برداشت کر سکتی۔ آپ نے مجھے ٹھہر ٹھہر کے پھانسی دی ہے!۔ میں آپ کے پاس چلی آؤں گی۔ میں چھوڑ دوں گی سب کو۔ میرے لئے آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے:" اور پھر وہ اپنے منہ زور جذبوں سے مغلوب ہو کر رونے لگی!۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہچکیاں لگ گئیں۔

شہزاد بھی کچھ دیر بول نہ سکا!۔ پھر اس نے آفریں کو بڑی نرمی اور آہستگی سے خود سے جدا کیا اور آہستہ سے کہا۔

"نہیں آفریں! نہیں۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہیں یاد ہے یہی گھر تھا۔ یہی کمرہ تھا۔ تب تم۔ میرے قریب آگئی تھیں۔ میں اس وقت اسی طرح بے ضبط ہو گیا تھا۔ لیکن تم نے کہا تھا کہ آپ میرے اپنے ہیں!۔ یہ الفاظ تمہارے اور میرے درمیان لوہے کی دیوار بن گئے۔ میں تمہاری تقدیس اور معصومیت کی پرستش کرتا رہا ہوں۔ آفریں!۔ اپنے ہاتھوں انہیں داغدار نہیں کر سکتا!:"

اور پھر وہ دفعتاً اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا!۔

"کیا ہوا!" آفریں گھبرا گئی۔

شہزاد کا چہرہ پسینے میں بھیگ رہا تھا!۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بہ دقت مسکرایا! "کچھ نہیں۔ بس ایک ٹیس سی اٹھتی ہے:"

آفریں نے جلدی سے کہا: "تو پھر آپ اپنے ڈاکٹر ——— !:"

"تمہاری موجودگی میں ڈاکٹر آ کے کیا کرے گا؟:"

"میں نے آپ کی اذیتیں بڑھا دی ہیں:" آفریں بولی۔

اس نے آفریں کی بات جیسے سنی ہی نہ ہو چپکے چپکے جیسے خود سے باتیں

مجبور کا گریہ۔ آنسوؤں کے سوا کسی اور چیز پر بس نہیں چلتا۔ آفریں نے اس کے سینے پر سر رکھ کے آنکھیں بند کر لیں۔ جنراد کا دل اس کے سینے میں بج رہا تھا!۔

بدن کی پیاس بڑی ظالم چیز ہے!۔

دوسرا دن عجیب سا اُداس اُداس تھا۔ اُوٹی پر سردی کی ردا محیط تھی۔ اور چاروں طرف کُہرا اچھا رہا تھا۔ چھوٹے سے ڈاک بنگلے کے احاطے میں گلاب کے پھولوں پر پالا مار گیا تھا۔ ان کی رنگ برنگی پنکھڑیوں کی فرش پر چادر گل سی بچھ گئی تھی۔ شاعروں اور مصوروں کی جنت، سیاحوں کی تفریح گاہ یخ بستہ مزار معلوم ہو رہی تھی!۔

آفریں پھر سے بیداری کا خواب دیکھ رہی تھی۔ کل سے اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی جیسے وہ اس دنیا کی باسی نہ ہو۔ وہ ایک خیال ہو۔ ایک واہمہ ہو۔ سوچنے اور محسوس کرنے کا بہت بڑا ذخیرہ لئے وہ دریچے کے سامنے گم صم سی بیٹھی تھی۔ اور اس کے دماغ میں گزرے ہوئے پانچ برسوں کا ایک چھوٹے سے چھوٹا لمحہ اپنی پوری توانائی اور شدت سے زندہ و متحرک ہو گیا تھا!۔

اسے خوف تھا۔ شدتِ احساس کہیں اسے پاگل نہ کر دے!۔

وہ یکبارگی چیخ نہ اٹھے۔

معبود۔ مجھ پر رحم کر۔
اسے تب پتہ چلا۔ محبت اتنی ظالم اور بے درد ہوتی ہے۔
جس کی اس نے مدتوں تک کوئی اہمیت نہیں جانی۔
پھر دور سے آوازیں آتیں اور اس کے گرد و پیش گونجنے لگتیں۔
"ان کے آس پاس پھر رہی ہو۔ خدا نہ کرے کہ تمھیں بھی کوئی دھکا لگے!"
"میں آپ کا انتظار کرتا رہوں گا!"
"ایک لڑکی مجھے ملی تھی۔ پتہ نہیں کہاں چلی گئی!"
"سو جاؤ۔ آفریں!۔ ابھی سویرا بہت دور ہے"
"محبت کو حماقت نہ کہو آفریں۔ یہ وہ جذبہ ہے۔ جس کی سنجیدگی اور سچائی پر کبھی نہ کبھی ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اور میں تو سمجھتا ہوں۔ جو محبت کو نہیں مانتا وہ خدا کو بھی نہیں مانتا"
یہ بازگشت اس کے لئے بڑی کرب ناک ثابت ہو رہی تھی۔ دل پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا!۔ اور کوئی اپنا نہ تھا جس سے دردِ دل کہہ کر وہ اپنی گھٹن دور کر سکتی!۔
تم رو رہی ہو۔ آفریں؟" سفیان اس پر جھکے۔
میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آج میں کچھ دیر کے لئے باہر جاؤں گی" وہ جارحانہ انداز میں بولی۔
شوق سے!" سفیان نے کہا "میں تمھیں روکتا تو نہیں"
اور وہ خود فراموشی کے عالم میں باہر نکلی۔ پاؤں رکھتی کہیں تھی اور

پڑنا کہیں اور تھا۔ اس کی سمجھ میں خود بھی نہیں آرہا تھا۔ اب وہ کس لئے اس کے پاس جارہی تھی کیا وہ اپنی بے خبری کی تلافی کرنا چاہتی تھی!۔

دور سے اُسے جانا پہچانا بنگلہ نظر آیا۔

پُرانے درو دیوار، زبانِ حال سے خوش آمدید کہتے ہوئے۔

وہ گھر۔ اس کا مکیں۔

"میرے اللہ۔ مجھے رُسوا نہ کر۔ ضبط مشکل ہے۔ مجھے یہیں موت دیدے"

اُس نے دھندلی آنکھیں اداس رنگ کے نیلے پھاٹک پر جمادیں۔ یہاں خلافِ معمول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کمپاؤنڈ میں گاڑی نہیں تھی۔ باغباں کے ہٹ کا در بند تھا۔

"آج انھیں میرا انتظار نہیں"! آفریں کے لبوں پر سسکی سی اُبھری۔

"کہاں ہیں وہ!" اس نے کال بل پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں خالی دالان میں گھنٹی بجی لیکن کوئی باہر نہیں آیا تھا۔

دفعتہً پڑوس کا پھاٹک کھلا اور ایک معمر آدمی سڑک پر آیا۔ اُس نے آفریں کو دیکھا اور ٹھہر گیا!۔

وہ بھی مستفسرانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"بڑا افسوسناک واقعہ ہے شاید آپ بھی اسی لئے تشریف لائی ہیں"! اس نے کہا۔

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی"! آفریں کے پاؤں کانپنے لگے۔

"میں نے کل بھی آپ کو دیکھا تھا"! اس نے بڑے دل گرفتہ انداز میں کہا: "آپ آئی تھیں مگر۔ آپ کے جانے کے بعد۔ قریباً پانچ بجے شام کو

مسٹر ضرار پر بہت شدید دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کا ملازم سکندر خاں انھیں فوراً سول ہسپتال لے گیا۔ ساری رات۔ وہ موت و زندگی کی کشمکش میں پڑے رہے اور آج صبح پانچ بجے۔ پورے بارہ گھنٹوں بعد ——!"

کیا ہوا۔؟" وحشت زدہ لہجہ میں آفریں بولی۔

انتقال ہو گیا!" اس نے کہا: "بے چارے یہاں تنہا تھے۔ اب میں ان کی لاش لانے جا رہا ہوں!"

اس پر شاید آسمان پھٹ پڑا تھا یا زمین پیروں تلے سے نکل گئی تھی ایک دفعہ وہ پاگلوں کی طرح چلائی۔

"نہیں ضرار۔ نہیں!"

اور بیہوش ہو کر گر گئی!!!"

تمام شد

کتابت:۔ سراج الدین احمد حجاب لسنوی